استعماری تاریخ کے
سیاہ اوراق

شہباز حسین بارا

استعماری تاریخ کے

سیاہ اوراق

اذان سحر پبلی کیشنز

منصورہ ملتان روڈ لاہور فون 5435667

نام کتاب	:	استعماری تاریخ کے سیاہ اوراق
نام مصنف	:	شہباز حسین بارا
ناشر	:	اذان سحر پبلی کیشنز منصورہ ملتان روڈ لاہور۔
اشاعت اول	:	اکتوبر 2005ء
مطبع	:	اے این اے پرنٹرز لاہور۔
قیمت	:	90 روپے

ملنے کے پتے:

- ......ادارہ معارف اسلامی منصورہ ملتان روڈ لاہور۔ 5432419
- ......ادارہ منشورات اسلامی بالمقابل منصورہ، لاہور۔ 7840584
- ......ادارہ مطبوعات طلبہ 1 اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور۔ 7553991
- ......کتاب سرائے، اردو بازار لاہور۔ 7320318
- ......دی بک ڈسٹری بیوٹرز، کراچی، 2787137
- ......مکتبہ تبلیغ اسلام، الاکرام بلڈنگ راولپنڈی
- ......مرکز مطبوعات کشمیر، الاکرام بلڈنگ، راولپنڈی۔ 714648
- ......ادارہ تعمیر افکار، جی ٹی روڈ، پشاور۔ 262407-091

فہرست

عرض ناشر

ہم برادر شہباز حسین بارا کی یہ کتاب، جو انسانی تاریخ کے انتہائی المناک پہلوؤں کو اجاگر کر رہی ہے، شائع کرتے ہوئے نہایت طمانیت محسوس کر رہے ہیں۔ تاریخ کے یہ تلخ اور سیاہ ابواب کمزور قوموں کے خلاف استعمار یعنی طاقتور ظالم قوموں کے ظلم سے عبارت ہیں۔ اور نئی نسل کے لئے معلومات اور رہنمائی کا خزانہ لئے ہوئے ہیں۔ یہ جان کر اطمینان اور خوشی کا یہ رنگ اور زیادہ گہرا ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب ایک ایسے طالب علم نے لکھی ہے جو انگریزی ادب کی تعلیم حاصل کر رہا ہے اور ایک صاحب اثر، جاگیردار گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ اونچے طبقے میں اس روشنی اور جذبے کا پہنچ جانا یقیناً ایک روشن مستقبل کی علامت ہے۔

شہباز حسین بارا نے جس جذبے اور ہمت کے ساتھ تاریخ کے مختلف ادوار میں استعمار کے ہتھکنڈے اور انسانیت کے خلاف ظالمانہ اقدامات بے نقاب کئے ہیں، وہ ان حکمرانوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہیں جو آج کے استعمار کی حاشیہ نشینی کر رہے ہیں۔ یہ بد قسمت لوگ بھول گئے ہیں کہ استعمار کی ہمیشہ یہ روایت رہی ہے کہ وہ اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے بعد اپنے ایجنٹوں کو کاٹھ کباڑ میں پھینک دیتا رہا ہے۔ حیرت ہوتی ہے پھر بھی ہماری ملت میں ایسا بکاؤ مال در آتا ہے۔

محترم قارئین! یہ کتاب انسانی تاریخ کے سارے سیاہ اوراق کا احاطہ نہیں کر رہی، سیاہ اوراق کا بہت سا حصہ ابھی باقی ہے۔ ان شاء اللہ تاریخ کے ان ابواب کو بھی بہت جلد قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ شیطان نے اپنے پیروکاروں کو کبھی بھی خاموش نہیں بیٹھنے دیا۔ اسے اپنے کارندے ہر دور میں مل جاتے رہے ہیں۔ اگر ان تمام سیاہ اوراق کو اختصار کے ساتھ بھی یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب وجود میں آ جائے گی۔ اس لئے سر دست اس کتاب کو سیاہ اوراق کا ایک حصہ سمجھیں۔ ان شاء اللہ شہباز حسین بارا صاحب کا قلم رواں رہے گا اور بہت جلد باقی سیاہ اوراق بھی منظر عام پر آئیں گے۔

ہم دعا گو ہیں، کاش یہ کتاب ان لوگوں کو راہ راست پر لا سکے جو اس دور کے استعمار امریکہ کے کسی بھی حوالے سے، کسی بھی طریقے سے ہاتھ مضبوط کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔ آمین

عباس اختر اعوان

انتساب

میرے ان پڑھ دادا حاجی فرزند علی بارا مرحوم کے نام، جو ہمارے عظیم صوفی دانشور جناب اشفاق احمد کے بابوں میں سے لگتے تھے۔ وہ زبان سے کم اور آنکھوں سے زیادہ بولتے تھے۔ شاید انہیں نظر آتا تھا۔

بقول محترمہ بانو قدسیہ صاحبہ

''آنکھیں روح کو دیکھتی ہیں!''

شہباز حسین بارا

پہلی بات

عجیب اتفاق ہے کہ ناچیز نے اس کتاب کا نام کچھ اور تجویز کیا تھا۔ لیکن محترم جناب عباس اختر اعوان صاحب نے کمپوزنگ کے دوران اس کا نام...... ''استعماری جنگوں کے سیاہ اوراق'' رقم کر دیا۔ سچی بات ہے کہ مجھے یہ عنوان بہت پسند آیا۔ میرا اور میرے خاندان کا سوشل سیٹ اپ بھی بالکل ''فیوڈل ازم'' کا عکس ہے۔ جب کتاب کے لئے والد گرامی جناب حاجی نیامت علی بارا صاحب سے رجوع کیا تو انہوں نے بھری محفل میں فرمایا:

''ہن اسیں کتاباں وچ کے چودھر کراں گے۔ ''شریکا'' کیہہ آکھے گا۔''

اسی ماحول میں رہ کر ایک ایک کر کے میں نے یہ ''سیاہ پتے'' اکٹھے کیئے ہیں۔ کن کن کتابوں کی روشنی نے مجھے یہ ''سیاہ اوراق'' عطا فرمائے، یہ بڑی لمبی داستان ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے ناچیز نے یہ صفحات اپنی نوجوان برادری کے لئے اکھٹے کیے ہیں۔ اتنا خوبصورت اور زرخیز TALENT اس ''ماحول'' میں دب کر رہ گیا ہے۔ اندر سے اٹھی ہوئی، یہی چیخ میری مجبوری تھی۔

میں کوئی سکہ بند ادیب نہیں ہوں بلکہ انگریزی ادب کا طالب علم ہوں۔ بس مختلف اخبارات میں لکھنے کا چسکا تھا۔ وہ پورا کرتا رہا۔ ان حالات میں مجھے ''آزاد'' ماحول عطا کرنے میں جن ہمدرد ہستیوں کا سایہ ہے ان میں محترم ملک سیف الملوک نمبردار، محترم شیر افگن صاحب، جناب ستار اشرف صاحب، جناب سرفراز زمان صاحب اور میڈیم عائشہ

عثمان صاحبہ قابل ذکر ہیں۔ میں ان ہستیوں کا ہمیشہ رہین منت رہوں گا۔

بحیثیت طالب علم میری یہ کاوشیں دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ افراتفری کے اس عالم میں اب بڑی بڑی کتابیں پڑھنا ذرا ناممکن سا ہوتا جا رہا ہے۔ کسی گھر میں کتابیں ہونا بہت بڑی نعمت ہے۔ اس عظیم نعمت کی ''کرنیں'' ایک ایک کر کے کیسے سنواریں۔ یہ ایک الگ داستاں ہے۔ کئی دفعہ تو ایسے ہوا کہ کپڑے خریدنے کے لیے پیسے ملتے تھے تو چوری چوری کتابیں لا کر ''ستر'' مکمل کر لیا کرتا تھا۔ سیانے کہتے ہیں کہ جب کوئی قوم، فرقہ، سلطنت، زوال پذیر ہوتی ہے تو اس میں کس طرح کا انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اور اقتدار کی جنگ میں کس قسم کے مظالم روا رکھے جاتے ہیں، اس کی چند دردانگیز مثالیں اس کتاب میں میسر آئیں گی۔

ہر معزز قاری سے میری درخواست ہے کہ اس کاوش سے متعلق اپنی قیمتی آراء سے ضرور نوازے، منتظر رہوں گا۔

اللہ حافظ

شہباز حسین بارا

125 اسلام بلاک اعظم گارڈن

ملتان روڈ لاہور

0333-4775889

پہلی جنگ عظیم

اگر ہم انسانی تاریخ کے اوراق پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک دنیا جھگڑا' فساد اور جنگ جیسی بیماریوں کا شکار رہی ہے۔ کبھی قومیت کا مسئلہ' کبھی اقتدار حاصل کرنے کی ہوس' کبھی مال و دولت حاصل کرنے کا لالچ تو کبھی دوسروں کو محکوم بنانے کی کوشش میں کروڑوں نفوس کو موت کی وادی میں دھکیل دیا گیا' لیکن زیادہ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ پیغمبروں کے علاوہ دنیا کے زیادہ تر عظیم لوگوں نے جنگ کی آغوش میں زندگی بسر کی۔

اگر ہم مائیکل ہارٹ کی شہرہ آفاق تصنیف "The Hundred" کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان عظیم لوگوں میں زیادہ تعداد ان جنگجوؤں کی ہے۔ جنہوں نے اپنے ادوار کی تاریخ کے باب انسانی خون سے رقم کیے' جن کی نمایاں مثال سکندر اعظم' چنگیز خان' ہلاکو خان' تیمور لنگ' ایڈولف ہٹلر' نپولین اور سٹالن جیسے سفاک انسان ہیں۔ ویسے تو دنیا میں ہزاروں چھوٹی اور بڑی جنگیں ہوئیں' مگر دو ایسی جنگیں ہیں جن کی وجہ سے آدھی سے زیادہ دنیا تباہ ہوگئی اور کروڑوں لوگوں نے اپنی جانیں گنوا دیں اور کروڑوں بے یار و مددگار ہوگئے ،جن کو بیماری و افلاس نے گھیر لیا۔ یہ دو جنگیں پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے نام سے مشہور ہیں۔ آج بھی لوگوں کی اکثریت یہ جاننے سے قاصر ہے کہ آخر وہ کیا وجوہات تھیں جن کی وجہ سے یہ عظیم المیہ رونما ہوا۔

انیسویں صدی میں برطانیہ اور روس دو بڑی طاقتیں تھیں مگر آخری عشروں میں جرمنی نے بھی اپنے آپ کو کافی مضبوط بنا لیا تھا۔ اس نے بھی دوسرے علاقوں تک رسائی کا پروگرام ترتیب دیا اور بغداد تک ریلوے پہنچانے تک کا ارادہ ظاہر کیا مگر دوسری طرف برطانیہ ہی وہ ملک تھا' جس نے 1914ء سے پہلے

صرف پچاس سالوں میں اپنی طاقت کو عروج پر پہنچا دیا۔ یہ ان اقوام کے لیے بھی خیر سگالی سے سرشار تھی جو اسی نوعیت کے عزائم رکھتی تھیں۔ اگر کسی قوم نے عالمی طاقت بننے کے لیے کوشش کی تو وہ برطانیہ کی قوم تھی۔ اس نے نہ صرف کوشش کی بلکہ اپنے مقاصد کو بھی پا لیا۔ انگلستان کی ملکہ نے ہندوستان کی فرمانروا بن کر دکھا دیا۔ برطانیہ ہی تھا جس نے عالمی طاقت کے توازن کو بڑی حد تک متزلزل کر دیا تھا۔ دنیا بھر میں اس کے بحری اڈے قائم تھے' دنیا کے بڑے تجارتی جہاز اس کے سامان کی بار برداری میں لگے رہتے تھے۔ لندن کی مالیاتی خدمات بے مثال اور شاندار تھیں' غرضیکہ ان صفات کے باعث عالمی اقتصادی نظام میں برطانیہ ایک بہت بڑے سرمایہ کار' بینک کار' تاجر اور بیمہ کنندہ کا مقام رکھتا تھا۔

اس وقت یورپ ساری دنیا کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مشرق بعید نے تمام معاملات یورپ میں طے کیے جاتے، اس نے آپ کو ایسی آگ میں پھنسا لیا جہاں سے نکلنا مشکل ہو گیا اور یہ آگ جنگ کی صورت میں تمام ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لیتی جا رہی تھی۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں کوئی بھی ایسا شخص موجود نہ تھا جو 50 سال بعد کی یورپی تباہی و بربادی کے بارے میں قبل از وقت کچھ بتا سکتا۔ لیکن دوسری طرف یہ حقیقت بھی نہیں جھٹلائی جا سکتی کہ کچھ دور اندیش دانشوروں' صحافیوں او سیاستدانوں نے بہر حال ایسے حالات کے درست رخ کا اندازہ کر لیا تھا۔ اس کا اندازہ ہم اس بات سے بخوبی لگا سکتے ہیں کہ کئی دانشوروں نے بڑی دیر پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آنے والے وقت میں امریکہ اور روس ہی دو عظیم طاقتیں ہوں گی۔ انیسویں صدی کے آخری عشروں میں امریکی صنعت و تجارت کا عروج اور ایشیاء میں روسی فوج کی سرگرمیاں دیکھ بڑے بڑے دانشور حیران و ششدر رہ گئے۔ حتیٰ کہ برطانیہ کی انتہائی محتاط قیادت نے بھی 1898ء میں یہ بات مان لی تھی کہ دنیا زندہ اور مردہ طاقتوں میں بٹ کر رہ گئی ہے۔ یورپ کے اندر اور باہر طاقت کے توازن میں ڈرامائی انداز میں تبدیلی ہوئی۔ پرانی سلطنتوں کا شیرازہ بکھرا اور نئی ریاستیں دنیا کے نقشے پر ابھریں۔ اسی طرح کی تبدیلی کو بھانپتے ہوئے کوریلی برنٹ "Correli Barnett" نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا:

''کوئی بھی ریاست صرف کیل کانٹے سے لیس افواج کے بل بوتے پر ہی طاقتور نہیں بن جاتی بلکہ اس کا انحصار اس کے معاشی و تکنیکی وسائل و ذرائع پر بھی ہوتا ہے۔ اس عمل میں مہارت قوت فیصلہ اور دور اندیشی و دور بینی کا بھی دخل ہوتا ہے جس کے ذریعے خارجہ حکمت عملی کا تعین کیا جاتا ہے۔ سماجی و سیاسی اداروں کی کارکردگی بھی اس حوالے سے خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ علاوہ ازیں یہ تمام باتیں عوام پر منحصر

ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عوام کے ہنر' طاقت' جذبے' نظم وضبط' پہل کرنے کا رجحان' ایمان' تصورات اور یہاں تک کہ اوہام بھی اس عمل میں اپنا خاص کردار ادا کرتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ عمل بھی اہم ہے کہ اس طرح کے تمام اسباب وعوامل باہم مربوط ہوتے ہیں۔ تاہم ریاستی یا ملکی قوت کا جائزہ لیتے وقت خارجی تعلقات اور حکومتی فرائض کو بھی مدنظر رکھنا بے حد ضروری ہے نیز ریاستوں کی قوتوں سے اس کا مقابلہ کرتے رہنا چاہیے۔''

دوسری طرف جرمنی بھی ترقی کی منازل طے کر رہا تھا۔ جرمنی کے عروج سے بڑی طاقتوں کے توازن پر فوری اور ہمہ گیر اثرات مرتب ہوئے۔ جرمنی ننھی منی ریاستوں کا مجموعہ تھا' جو نااہل جاگیرداروں کے سامنے تلے گھسٹ رہا تھا لیکن پھر یہ یورپ کا نہایت طاقتور ملک بن گیا جو دن بہ دن طاقت اور استحکام حاصل کرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ پہلی جنگ عظیم کے موقع پر وہ اٹلی' فرانس' جاپان اور روس سے کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ اس کی آبادی جو 1890ء میں 49 ملین تھی' 1913ء میں بڑھتے ہوئے 66 ملین ہوگئی۔ معیار تعلیم بھی انتہائی بلند تھا۔ ایک ہزار جرمن فوجیوں میں صرف ایک ان پڑھ ہوتا تھا۔

کسی بھی ملک کی جنگ کا آغاز سفارتی سطح پر ہوتا ہے۔ اس وقت اتحاد قائم کرنے کی جو روش چل نکلی تھی' اس سے دوری پر واقع امریکہ تو متاثر نہیں ہوا تھا اور جاپان بھی محض علاقائی سطح پر ہی اس رجحان سے متاثر ہوا۔ وہ بھی صرف 1902ء اور 1905ء میں جب اس نے برطانیہ سے اتحاد قائم کیا تھا۔ امن کے زمانے میں فوجی اتحاد قائم کرنے کی طرف پہلی مرتبہ بسمارک نے 1879ء میں قدم بڑھایا تھا۔ ویانا کی خارجہ پالیسی پر قابو پانے اور روس کو دھمکانے کے لیے اس نے آسٹریا سے اتحاد کیا۔ بسمارک کا طویل منصوبہ یہ تھا کہ روس نے آسٹریا ہنگری پر حملہ کیا تو جرمنی اس کی مدد کو پہنچے گا۔ 1882ء میں جرمنی نے اسی طرح کا ایک معاہدہ روم کے ساتھ کیا۔

دوسری طرف ایک عارضی وقفے کے بعد فرانس اور روس کے تعلقات نے پھر سنبھالا لیا۔ 1890ء کی دہائی میں یورپی معاملات سے دور بھاگنے والا برطانیہ اپنے دیرینہ حریف فرانس اور روس کی طرف سے کافی دباؤ محسوس کرنے لگا۔ جب مشرق بعید میں محاذ آرائی کا آغاز ہوا تو برطانیہ اور فرانس نے اپنے نو آبادیاتی قبضے کو ختم کر کے اپریل 1904ء میں دوستی کر لی۔ 1904-05ء کے سفارتی انقلاب کے دو بنیادی اسباب تھے' ایک برطانیہ اور فرانس دونوں جرمنی کو مشکوک خیال کرتے تھے اور دوسرے یہ کہ ہنگری کے معاملے میں جرمنی کی دلچسپی فرانس کو پسند نہ تھی جب کہ بغداد کی طرف بھی جرمنی کی نظر برطانیہ

کو بری لگتی تھی۔ علاوہ ازیں مراکش کے بحران کے باعث بین الاقوامی نوعیت کی دشمنیاں افریقہ سے نکل کر براعظم یورپ تک پھیل گئیں۔ 1907ء میں بروشیا' تبت اور افغانستان کے حوالے سے برطانیہ اور روس میں مفاہمت ہو گئی۔ اس کے نتیجے میں برطانیہ کے لیے ہندوستان پر حکومت کرنا اور آسان ہو گیا۔ دوسری طرف جرمنی اپنے آپ کو یورپ میں محصور سمجھنے لگا۔ اس طرح وہ انتہائی وسیع پیمانے پر جنگی جہازوں کی تیاری میں مصروف ہو گیا تاکہ برطانیہ کا مقابلہ کر سکے۔ برطانیہ کو تشویش ہوئی اور سفارتی کوششیں ہونے لگیں۔ جرمنی یہ مقابلہ بازی چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا اور شرط یہ رکھی کہ برطانیہ یہ معاہدہ کر کے جنگ سے لاتعلق رہے گا' لیکن اس پابندی سے برطانیہ متفق نہ تھا۔

مراکش کے جھگڑے نے پھر سر اٹھایا تو برطانیہ نے فرانس کی بھرپور حمایت اور جرمنی نے سخت مخالفت کی۔ ساتھ ہی جرمنی کی عسکری فروغ کی کاروائیوں کے پیش نظر انگلستان نے 1912ء میں فرانس کے ساتھ بحری مفاد کا ایک سمجھوتہ کر لیا۔ لیکن اس وقت تک اٹلی کی فوج ترکی پر حملہ آور ہو چکی تھی۔ یہ قدم بلقان لیگ سے وابستہ ریاستوں کے حوالے سے اٹھایا گیا تھا۔ اس حملے کا نتیجہ عثمانی سلطنت کی یورپ سے بے دخلی کی صورت میں برآمد ہوا اور پھر لیگ کے رکن مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے۔ ریاست ہائے بلقان سے مستفیض ہونے کا جو سلسلہ چل نکلا تھا' اس پر بڑی طاقتوں کا قابو پانا دشوار تھا نیز بعض ایسے نئے حالات رونما ہوئے تھے جو بڑی طاقتوں کے اہم مفادات کے یکسر منافی تھے مثلاً سربیا میں بیداری کی لہر دوڑنے سے ویانا چوکس ہو گیا اور ترکی پر جرمنی کی فوج کے بڑھتے ہوئے اثرات نے روس کو خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔

31 جولائی کی آدھی رات کو کیسر دوم نے فرمان جاری کیا کہ اگر روس بارہ گھنٹے کے اندر اندر آسٹرین علاقے کے چار حصوں میں اپنی فوج کی نقل و حرکت بند نہ کی تو جرمن فوجیں پوری طرح حرکت میں آ جائیں گی۔ اس بیان سے روسی عوام میں جنگ کا جوش بیدار ہو گیا۔ زار روس نے جھکنے کی بجائے چالیس لاکھ افراد کو جرمنی کے کسی بھی وقت ممکنہ حملے کے لیے تیار رہنے کا حکم دے دیا۔ بارہ گھنٹے گزرنے کے بعد جرمنی نے روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور اس طرح یورپ ایک خونی اور خوفناک جنگ کی لپیٹ میں آ گیا۔

اگست کے آخر میں ایک کروڑ ستر لاکھ افراد اور آٹھ قومیں اس جنگ میں الجھ چکی تھیں۔ جسے ہم عظیم یورپی جنگ کا نام دیتے ہیں۔ اس کا دائرہ کار اتنا وسیع تھا کہ اس سے قبل اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

ایسے میں جب جون 1914ء میں آرک ڈیوک' فرینڈوکو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تو آسٹریا ہنگری پہلے سربیا پھر روس کے خلاف سخت اقدامات کرنے پر مجبور ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قتل ایک ایسی چنگاری تھی جو آگ بھڑکانے کا باعث بنی۔ یہ قتل تاریخ میں بہت مشہور ہے' جس نے پہلے تو ایک عام بحرانی کیفیت پیدا کی اور پھر عالمی جنگ کے شعلوں کو ہوا دی۔ بعد میں ہر بڑی طاقت اپنے مفادات کی خاطر اس میں کود پڑی۔

اس جنگ کا جائزہ اگر اتحاد کی اہمیت کے حوالے سے لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگر روس آسٹریا' ہنگری پر تنہا ٹوٹ پڑتا تو فتح یقیناً اس کی تھی اور ایسا ہی نتیجہ جرمن کو حاصل ہوتا، اگر وہ فرانس پر حملہ آور ہوتا۔ اتحاد سے جنگ کا فیصلہ اتنی آسانی سے نہیں ہوتا۔ اگر ایک متحارب قوت کو جنگ میں وسائل کی کمی یا شکست سے دوچار ہونے کا خطرہ ہو تو اس کے حلیف امداد فراہم کرتے ہیں۔

بلجیئم کے راستے فرانس پر حملہ آور ہونے کے جرمن حکومت کے فیصلے کے باعث برطانیہ کو بھی مداخلت کا موقع مل گیا۔ اس کے بعد اس خونی جنگ کا آغاز ہوا جس نے کروڑوں انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہر فریق کے لاکھوں سپاہی سرحد کے پار رینگ رہے تھے اور اس صورت میں خاص طور پر مغربی یورپ میں فتح کا حصول ممکن نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی فریق بھی دشمن کے دفاعی ٹھکانوں تک اپنی فوج بھیجنے کے قابل نہیں تھا اور ایسے میں ہر فریق کی فوج پیش قدمی سے قاصر رہتی تھی۔ جرمنی نے ستمبر 1914ء میں فرانس اور بلجیئم کی طرف طوفان کی تیزی سے پیش قدمی کر کے بلند علاقے پر قبضہ جما لیا تھا' یوں اسے مغربی محاذ کی نگرانی کا موقع ملا۔ دوسرے جغرافیائی لحاظ سے بھی جرمنی کو بہت سے فوائد حاصل تھے۔ مشرق تا مغرب مواصلاتی نظام کے بہترین ہونے کی وجہ سے وہ گھیرے میں آنے کے باوجود نکلنے میں کامیاب ہو جاتا۔

ترکی نے ڈرامائی انداز میں 29 اکتوبر 1914ء کو روسی بحیرہ اسود کے علاقوں اوڈیسہ' سورستوپول اور تھیوڈوسیا پر بیک وقت حملہ کر کے اتحادیوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ترکی کے جنگ میں اچانک کود پڑنے کی وجہ ترکی کے وزیر دفاع انور پاشا کا جرمنی کی طرف جھکاؤ اور استنبول کی بندرگاہ پر جرمنی کے دولڑاکا بحری جہازوں کی موجودگی قرار دی جاتی ہے۔ جنرل ایڈمرل وان سوشن ترکی بیڑے کی کمان کر رہا تھا۔ ترکی کے جنگ میں شامل ہونے سے اتحادیوں کے لیے پیچیدہ صورتحال پیدا ہو گئی تھی۔ برطانیہ نے ترکی کے اس اقدام کے پیش نظر اس کے خلاف فوری ایکشن لینے کے لیے کوئی وقت ضائع نہ کیا تاکہ

اتحادی ترکی کے راستے روس تک رسائی حاصل کر سکیں۔

فرانس اور برطانیہ کی فوجیں 1915ء کے عرصے میں مغربی محاذ آرائی میں مصروف رہیں۔ اس لڑائی میں فرانس کو مزید نقصان اٹھانا پڑا اور برطانیہ کے بھی تین لاکھ سپاہی ہلاک ہوئے۔ اس دوران جرمنی نے زوردار قسم کے مسلسل حملوں کی پوری طرح تیاری کر لی۔ اس کا سب سے اہم مقصد میدان جنگ میں موجود روسی فوج کا خاتمہ تھا۔ دوسری طرف اس کی فوج میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا' جسے دیکھ کر جرمنی کے عزائم ناممکن لگ رہے تھے' لیکن 1915ء میں جرمنی کی اعلیٰ پائے کی فوج نے روس کو بری طرح تباہ کر دیا۔ 1916ء کو بھی روس کو کافی نقصان اٹھانا پڑا' جب لاکھوں سپاہی ہلاک و قیدی بنا لئے گئے۔ مغربی محاذ پر 1915ء میں تقریباً ساڑھے 8 لاکھ جرمن فوجی جانی نقصان سے دوچار ہوئے اور 1916ء میں یہ تعداد مزید بڑھ گئی۔

امریکہ کی ہمدردیاں اتحادیوں کے ساتھ تھیں کیونکہ یہ جمہوری سلطنتیں امریکہ کے ساتھ نظریاتی وابستگی رکھتی تھیں۔ دوسری طرف امریکی برآمدات کے تاجروں کا رجحان بھی مغربی یورپ کی منڈیوں کی طرف زیادہ تھا۔ امریکہ اتحادیوں کو کروڑوں ڈالر کی امداد فراہم کر چکا تھا اور اس کے سرمایہ داروں کے بھرپور زور کے بعد امریکہ نے اس جنگ میں حصہ لیا۔ اس کے علاوہ جو بنیادی وجہ بنی وہ یہ تھی کہ جرمنی نے اپنی آبدوزوں کے ذریعے اتحادیوں کے جہازوں کو غرق کرنا شروع کر دیا۔ آبدوزوں کی کاروائی اتنی کامیاب تھی کہ انگلستان کو اناج کی رسد کم ہو گئی اور وہاں بھی قحط کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ مئی 5 1915ء میں جرمن آبدوزوں نے انگریزوں کا تجارتی جہاز ''لوزیتانیہ'' غرق کر دیا جس میں سینکڑوں لوگ بھی ڈوب گئے۔ ''لوزیتانیہ'' بحر اٹلانٹک میں امریکہ اور انگلستان کے درمیان سفر کیا کرتا تھا۔ جب یہ جہاز جرمنوں کا نشانہ بنا تو ڈوبنے والوں میں بہت سے امریکی باشندے بھی تھے۔

جرمن آبدوزوں کے باوجود غیر جانبدار ملکوں کے جہازوں کے ذریعے وافر مقدار میں اناج انگلستان پہنچتا رہا کیونکہ کسی بھی غیر جانبدار کو نقصان پہنچانا جنگ کے فیصلوں کے خلاف تھا۔ جنگ نے ایک اور موڑ لیا' جب مئی 1916ء میں شمالی سمندر میں ایک زبردست جنگ ہوئی' اسے جٹ لینڈ کی لڑائی کہتے ہیں۔ اس معرکہ میں برطانیہ کو مکمل کامیابی ہوئی۔ جرمنی اور آسٹریا کے عوام کو فاقوں کا سامنا کرنا پڑا۔

جرمنی نے امن کے لیے اشارے کرنا شروع کر دیئے' مگر اب اتحادی مکمل کامیابی سے کم کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ اس صورتحال میں جرمنوں نے اپنی آبدوزوں کی جنگی حکمت عملی میں شدت پیدا کرنے

کا فیصلہ کیا تا کہ بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر برطانیہ سر جھکانے پر مجبور ہو جائے۔ انہوں نے جنوری 1917ء میں اعلان کیا کہ مخصوص سمندر میں نظر آنے والے غیر جانبدار جہازوں کو بھی ڈبو دیا جائے گا۔ اس طرح غیر جانبدار جہاز برطانیہ کو خوراک نہیں پہنچا سکے گا۔ یہ اعلان امریکہ کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ وہ اپنے جہازوں کی غرقابی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ جرمنوں کے اعلان نے امریکہ کو بھی میدان جنگ میں کودنے پر مجبور کر دیا۔

اس جنگ میں 8 جنوری 1918ء کا دن بڑی اہمیت اختیار کر گیا جب امریکی صدر وڈرو ولسن نے بعد از جنگ کے مسائل سے نبٹنے کے لیے چودہ نکات پیش کیے تھے۔ یہ نکات انہوں نے کانگرس کے مشترکہ اجلاس میں پیش کیے۔ جن کے مطابق

1- فوری طور پر معاہداتِ امن کیے جائیں۔

2- حالت جنگ اور امن میں، سمندر میں آزادانہ رسائی۔

3- تجارت میں معاشی رکاوٹوں کو دور کیا جائے اور تجارت کے یکساں مواقع فراہم کیے جائیں۔

4- ہتھیاروں میں تخفیف کی جائے۔

5- نوآبادیاتی نظام کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے اور نوآبادیات کے عوام کے حقوق کو اہمیت دی جائے۔

6- روسی علاقوں کا انخلا اور روس کو اپنے ادارے آزادانہ طور پر قائم کرنے کا اختیار دیا جائے۔

7- بیلجیئم کا بلا شرط انخلاء تمام فرانسیسی علاقے کو خالی کیا جائے جس میں Alsace Lorraine کے علاقے کی بازیابی بھی شامل ہو۔

8- نوآبادیاتی نظام کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے اور نوآبادیات کے عوام کے حقوق کو اہمیت دی جائے۔

9- اٹلی کی سرحد کو بین الاقوامی سرحد کے مطابق ٹھیک کیا جائے۔

10- آسٹریا ہنگری کے عوام کو خود مختاری دی جائے۔

11- رومانیہ، سربیا، اور مونٹے نیگرو کو خالی کیا جائے اور سربیا کو سمندر تک رسائی دی جائے۔

12- ترکوں کو سلطنت عثمانیہ میں خود مختاری دی جائے۔ لیکن دوسری قوموں کو انفرادی طور پر ترقی کرنے کا موقع دیا جائے۔

13- پولینڈ کی ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے جس کی رسائی سمندر تک ہو۔

14- اقوام کی ایسی مشترکہ ایسوسی ایشن بنائی جائے جو تمام اقوام کی آزادی اور علاقائی سلامتی کی

گارنٹی دے سکے۔

امریکہ کے وسائل بے پناہ تھے۔ مصروف جنگ تمام ملکوں کے برعکس وہ تازہ دم تھا چنانچہ اس کی آمد پر یہ بات یقینی ہوگئی کہ اب جرمن طاقت کی شکست یقینی ہے۔ اسی دوران ایک بہت بڑا واقعہ انقلاب روس کی شکل میں پیش آیا۔ روسی انقلاب کے آٹھ ماہ بعد دوسرا انقلاب آیا جس نے سوویتوں اور بالشویکیوں کو اقتدار دے دیا۔ ان کا نعرہ ''امن'' تھا۔ انہوں نے متحارب ملکوں کے محنت کشوں اور سپاہیوں سے امن کی اپیل کی اور کہا کہ یہ سرمایہ داروں کی جنگ ہے۔ یہ بات دوسری فوجوں کے سپاہیوں تک بھی پہنچی اور کافی اثر انداز بھی ہوئی۔ جرمنی کی فوج پر اس کا زبردست اثر ہوا۔

روس پر جرمنی نے مارچ 1918ء میں ایک جبری اور شرمناک امن مسلط کیا۔ انہوں نے قبول کر لیا کیونکہ وہ ہر قیمت پر یہ چاہتے تھے۔ امریکی' برطانوی اور فرانسیسی فوج کو ایک سپریم کمانڈر دے دیا گیا تاکہ مربوط تعاون سے متحدہ کاروائی کی جا سکے۔ اب پیش قدمیاں اور کامیاب حملے اتحادیوں کا مقدر تھے۔ وہ جرمنوں کو مسلسل پیچھے دھکیل رہے تھے۔ اکتوبر میں اختتام قریب آ گیا' جنگ بندی کی باتیں ہونے لگیں۔

آخر 30 اکتوبر 1918ء کو ترکوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ترکی اور برطانوی نمائندوں نے ایک بحری جہاز آگامنون (Agamemnon) پر دستخطوں کی کاروائی مکمل کی جو خلیج مدروس پر لنگر انداز تھا۔ معاہدے کے مطابق ترکی اپنی فوجوں کو غیر مسلح کرے گا' قیدیوں کو رہا کرے گا اور اتحادی جہازوں کو گزرنے کے لیے Dardanells کا راستہ بحال کرے گا۔

ہتھیار ڈالنے کی کاروائی برطانیہ کے لگاتار اور موثر حملوں کے بعد عمل میں آئی۔ اس مہینے کے آغاز پر بیروت' ترپولی اور دمشق برطانیہ کے قبضے میں آ گئے تھے۔ آخری لڑائی شرقت کے مقام پر لڑی گئی جس میں گیارہ ہزار ترک قیدی بنائے گئے۔

اس دن سلطان محمد ششم نے اپنے ان تمام وزراء کو فارغ کر دیا جو جنگ جاری رکھنے کی حمایت کر رہے تھے۔ سلطان نے امریکی صدر کو تار بھیجا تھا جس میں کسی ممکنہ سمجھوتے کے لیے مداخلت کی اپیل کی گئی تھی لیکن ولسن کی طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ اس کے بعد سلطان نے جنرل ٹاؤنشنڈ کو ڈھائی سال بعد رہا کر دیا۔ سلطان کی ہدایت پر اس جنرل نے امن کی درخواست دائر کی۔ مسوپوٹامیہ کو ترکوں سے آزاد کرانے کے لیے اتحادیوں کی 15،814 جانیں ضائع ہوئیں جن میں 12,807 افراد

بیماریوں میں ہلاک ہوئے۔

4 نومبر کو کہل کے مقام پر جرمن بحریہ میں بغاوت ہو گئی اور پانچ دن بعد برلن میں ایک جرمن جمہوریت کا اعلان کر دیا گیا۔ اسی روز یعنی 9 نومبر کو غیر متوقع طور پر اور ذلت و رسوائی کے ساتھ کیسر ولیم دوم جرمنی سے ہالینڈ فرار ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی زولرون شاہی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ گیارہ نومبر کی ایک جنگ بندی پر دستخط ہوئے۔ جنگ بندی "چودہ نکات" پر مشتمل تھی جو امریکہ کے صدر ولسن نے دیئے تھے۔ یہ نکات کافی حد تک جنگ میں ملوث چھوٹی قوموں کے حق خودداری کے اصولوں پر مبنی تھے۔ ان میں چند ایک یہ تھے' تخفیف اسلحہ' خفیہ سفارت کاری سے اجتناب' بڑی طاقتوں کی طرف سے روس کی مدد اور لیگ آف نیشنز کا قیام ان نکات کا موضوع تھا۔

اب آخری نظر مالی اخراجات پر ڈالتے ہیں۔

اتحادیوں کے مجموعی اخراجات چالیس کھرب ننانوے کروڑ چھیانوے لاکھ ڈالر اور جرمنوں اور ان کے حلیفوں کے مجموعی اخراجات پندرہ ارب بارہ کروڑ تیس لاکھ ڈالر تھے۔

اس جنگ عظیم کے متعلق معروف تاریخ دان ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں کہ 1914ء کی پہلی جنگ عظیم نے یورپی معاشرے کی سوچ و فکر اور ذہن میں زبردست تبدیلی کی۔ کیونکہ یہ جنگ دوسری جنگوں سے مختلف تھی' اس میں پہلی مرتبہ تباہ کن ہتھیار استعمال ہوئے۔ خندقوں میں فوجیوں کو بلکہ جو اس سے دور تھے' انہیں بھی ہلا کر رکھ دیا۔ خون ریزی' قتل عام اور محاذ کی ہولناکیاں' ان سب نے یورپ کے ان خوابوں کو چکنا چور کر دیا کہ جو وہ مسلسل ترقی میں دیکھ رہے تھے اور اس پر یقین کر رہے تھے کہ یورپ خوشحال ہوگا اور دنیا پر چھا جائے گا۔ مگر جنگ نے ترقی کے اس عمل کو نہ صرف روک دیا بلکہ مایوسی' ناامیدی اور عدم تحفظ کے احساسات کو پیدا کیا۔

جنگ کے اختتام پر بہت سے لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر کسی نے غلط مقصد کے لیے جان دے دی تو پھر کیا اس کی قربانی ہوگی یا نہیں؟ وطن پر جان دینا ایک عظیم قربانی ہے جسے یاد رکھا جاتا ہے۔ اس استدلال کو صحیح ثابت کرنے کے لیے تاریخ ادب اور آرٹ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ جنگیں مقدس بن جاتی ہیں' شہید ہیرو ہو جاتے ہیں۔

جنگ کے دوران اور جنگ کے خاتمہ پر وہ تمام خاندان جن کے لڑکے فوج میں تھے اس کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ جنگ کے بعد ان سب لوگوں کیلئے انتظار کا صبر آزما مرحلہ تھا

اور یہ سوال کہ کیا ان کے رشتہ دار زندہ ہیں۔ یا محاذ پر مارے گئے؟ فرانس میں جب کسی فوجی کے مرنے کی خبر آتی تو گاؤں کے میئر کا یہ فرض تھا کہ وہ اس خبر کو مرنے والے کے خاندان تک پہنچائے۔ جب خبر دینے کے لئے یہ اپنے آفس سے نکلتا تو لوگ گھروں کے دروازوں پر کھڑے ہو کر امید وبیم کی حالت میں اس کو دیکھتے کہ وہ کس کے گھر کے سامنے ٹھہرتا ہے' جن گھروں کے سامنے سے وہ گزرتا جاتا تھا' وہ لوگ اطمینان کا سانس لیتے تھے۔ برطانیہ میں یہ رواج تھا کہ عام فوجی کے مرنے کی خبر خط کے ذریعہ دی جاتی تھی' اگر افسر ہو تو ٹیلی گرام بھیجا جاتا تھا۔ آسٹریلیا میں یہ کام چرچ کا عہدیدار کرتا تھا۔ مرنے والوں میں بہت سے ایسے فوجی ہوتے تھے جن کو بغیر کسی شناخت کے دفن کر دیا جاتا تھا۔ ان کے خاندان عرصہ تک اس امید میں رہے کہ وہ زندہ ہیں اور وہ واپس آئیں گے۔

جنگ کے بعد بیواؤں اور یتیموں کی ایک بڑی تعداد ایسی تھی کہ جنہیں نئے حالات میں خود کو معاشرہ میں ڈھالنا بڑا مشکل تھا۔ انہیں اپنے قریبی رشتہ دار کے کھونے کا جو افسوس تھا۔ اس کا ردعمل کبھی کبھار بڑا سخت ہوتا تھا۔ جنگ کے نتیجہ میں صرف جرمنی میں 525000 بیوائیں اور دس لاکھ یتیم تھے ان کو جو پنشن ملتی تھی وہ اتنی کم تھی کہ ان کا گزارا مشکل سے ہوتا تھا۔ اس لیے جنگ کے بارے میں ان کے خیالات بدل گئے تھے۔ یہ جنگ ان کے لیے قیامت تھی کہ جس نے ان عزیزوں کو چھین کر انہیں بے سہارا کر دیا تھا معاشرہ جنگی ہیروز کی تعریف کرتا تھا۔ مگر جو اس سے جڑے ہوئے تھے انہیں فراموش کر دیا تھا۔

اتحادیوں نے جرمنی کو یہیں نہیں چھوڑ دیا بلکہ جنگ کے خاتمے کے بعد 24 جنوری 1921ء کو اتحادیوں نے پیرس میں فیصلہ کیا کہ جرمنی کو تاوان جنگ کے طور پر 56 بلین ڈالر ادا کرنے ہوں گے۔ علاوہ ازیں جرمنی کو اپنی ایکسپورٹ پر 12.5 فیصد ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔ جرمنی نے اس میٹنگ میں نمائندگی نہیں کی تھی اور انہیں اس فیصلے پر اختلاف تھا۔ فرانسیسی وزیراعظم برائنڈ اور برطانوی وزیراعظم لائیڈ کے درمیان شدید اختلافات سامنے آئے۔ ایک موقع پر لائیڈ جارج فرانس کے تاوان کے مطالبے پر اتنے پریشان ہوئے کہ انہوں نے میٹنگ میں جانے سے انکار کر دیا۔ برائنڈ تاوان جنگ سے زیادہ کا مطالبہ کر رہے تھے کہ جنگ کے بعد جرمنی اپنی خوشحالی میں فرانس کو حصہ دے۔ ایکسپورٹ پر مطالبہ بھی فرانسیسی وزیراعظم کا تھا۔ اس کے علاوہ یہ فیصلہ بھی ہوا کہ اگر جرمنی ادائیگی میں ناکام رہا تو اتحادی رہائن لینڈ میں اپنی فوج بھیج دیں گے اور روہر پر دوبارہ قبضہ کر لیں گے۔

اتحادیوں کے ماہرین معاشیات کے مطابق جرمنی اپنے بجٹ میں فوجی اخراجات کم کرکے اور شاہی اخراجات ختم کر کے آدھا تاوان جنگ ادا کرسکتا ہے۔ لیکن جرمن مارک کی قدر اتنی تیزی سے کم ہو رہی ہے کہ ایک نامہ نگار کے مطابق تاوان جنگ حاصل کرنے کی کوشش کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ چاند پر گولی چلانا یورپی اتحادیوں کی تاوان جنگ کی ادائیگی کے مطالبے پر جرمنی نے ۵ فروری ۱۹۲۱ء کو سخت احتجاج کیا۔ جرمنی کی وزارت خارجہ امریکہ کے ساتھ ایک علیحدہ امن معاہدہ کی راہ تلاش کر رہی تھی۔ جرمنی کو یقین تھا کہ امریکی صدر برطانیہ اور فرانس کو معاشی شرائط نرم کرنے پر آمادہ کرلیں گے۔ جرمنی کی ٹریڈ یونینوں نے اتحادیوں کی شرائط پر سخت احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ جرمن عوام نقصان کی تلافی کے لیے تیار ہے لیکن ان کے بیان کے مطابق وہ عالمی سرمایہ داروں کے مفاد کے لیے اپنے آپ کو برباد نہیں کر سکتے۔

بالآخر 27 اپریل 1921ء کو اتحادیوں نے جرمنی کو تاوان جنگ کا بل پیش کر دیا۔ بل توقع سے کم تھا۔ یہ 132 بلین مارک کے برابر تھا۔ جو موجودہ ایکسچینج ریٹ کے مطابق 38 بلین ڈالر کے قریب بنتا ہے۔ بل کے پیش کیے جانے کے بعد اتحادیوں اور جرمنی میں ایک تلخ بحث کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پچھلے ہفتے تلافی جنگ کے کمیشن نے جرمنی کو حکم دیا کہ وہ اپنا تمام محفوظ سونا اتحادیوں کی نگرانی میں دے دے۔ فرانسیسیوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ یکم مئی کو روہر پر قبضہ کرلیں گے۔ دوسری طرف امریکہ نے اس معاملے میں اپنے آپ کو غیر جانبدار رکھتے ہوئے جرمنی کی درخواست کو رد کر دیا تھا۔

آخر کار 25 جنوری 1923ء کو فرانس اور بلجیم کی فوجوں کے روہر کے صنعتی علاقے پر قبضہ سے جرمنی میں مظاہروں کا نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ محنت کشوں نے دو گھنٹے کی ہڑتال کا اعلان کر دیا جبکہ فرانسیسی فوج نے مظاہرین پر گولیاں چلائیں۔ بہت بڑا ہجوم بسمارک اور دوسرے جرمن ہیرو کے مجسموں کے سامنے جمع ہو گیا اور انہوں نے فرانسیسیوں کے خلاف نعرہ بازی کی۔ فرانس نے اعلان کیا تھا کہ جب تک جرمنی تاوان جنگ کی ادائیگی پر رضا مند نہیں ہوتا فرانسیسی اپنے ارادوں پر جمے رہیں گے۔ جرمنی اور بلجیم کی فوجیں دو ہفتے قبل اس وقت حرکت میں آئی تھیں جب جرمنی معاہدے کے مطابق کوئلہ اور لکڑی کی سپلائی دینے میں ناکام رہا۔ فرانس اور بلجیم کے ایکشن کو اتحادیوں نے متفقہ طور پر تسلیم نہیں کیا تھا۔ جرمنی نے احتجاجی طور پر فرانس اور بلجیم کو تاوان جنگ کی ادائیگی فوری طور پر روک دی تھی۔ جرمنی کی کال پر تمام مزدوروں نے کارخانوں میں فوری طور پر کام روک دیا۔ جس کے نتیجے میں فرانس کے دستوں نے صنعتی

مراکز، کوئلہ کے ذخائر، ٹرانسپورٹ کے نظام پر قبضہ کرتے ہوئے مزدوروں کی تنخواہ روک دی اور خاص کاروبار میں پرائیویٹ ملکیت کا خاتمہ کر دیا۔

ان حالات کی وجہ سے جرمنی کی کرنسی کی قدر اتنی تیزی سے گھٹ رہی تھی کہ صرف تین ہفتوں میں اس کی قدر گھٹ کر آدھی ہو چکی تھی۔ 22 جون 1923ء تک ایک ڈالر 74,500 مارک کے برابر تھا۔ جو اس ماہ کے آخر تک 1;36,000 مارک کے برابر تھی۔ جنگ نے جرمنی کو سخت نقصان پہنچایا مگر زیادہ نقصان بلجیئم اور فرنس کے روہر پر قبضے کے نتیجے میں ہوا۔ روہر کے علاقے سے ہزاروں جرمنوں کی نقل مکانی سے جرمنی کو مزید مشکلات کا سامنا تھا۔ 15 نومبر 1923ء کو تو جرمن مارک کی قدر اس قدر کم ہوئی کہ جرمن بچے مارک سے کھیل رہے تھے۔ کرنسی کی قدر اتنی تیزی اور ڈرامائی انداز سے گر رہی تھی کہ مشین ڈاک کی ٹکٹیں نہیں چھاپ رہی بلکہ انہیں ہاتھ سے لکھا جا رہا تھا۔ ایک ڈالر کی قیمت چار ٹریلین مارک کے برابر تھی۔ جنگ سے پہلے ایک ڈالر چار مارک کے برابر تھا۔ ان دنوں میں ایک پاؤنڈ چینی کی قیمت 250 ملین مارک تھی۔ ایک پاؤنڈ گوشت کی قیمت تین ٹریلین سے زیادہ تھی۔ برلن میں ایک مزدور کو ایک دن کا معاوضہ تین ٹریلین مارک دیا جاتا تھا۔ جرمن کے سنٹر بنک نے ایک نیا مارک جاری کیا تھا جو ایک ٹریلین مارک ظاہر کرتا تھا۔ اس طرح جرمنی میں تین کرنسیاں چل رہی تھیں۔ نیا مارک، پرانا مارک، اور اس سے پرانا سونے کا مارک۔ اس طرح جرمنی جنگ کے بعد بھی اتحادیوں کے ظلم کا نشانہ بنا رہا۔

جنگ عظیم دوئم

پہلی جنگ عظیم نے ہر چیز اور ہر فرد کو بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔اس نے پرانی دنیا کو مکمل طور پر بے ترتیب کر دیا۔اب تک نظریات اور تصورات کے جو نظام مرتب کیے تھے۔جنگ نے انہیں لرزہ براندام کر دیا۔نوجوانوں کو خوفناک موت کے ہاتھوں ضائع ہوتے دیکھا۔ظلم و بربریت اور تباہی و بربادی کے ہولناک مناظر دیکھے۔نپولین کی معزولی کے بعد انیسویں صدی کا زمانہ آج بھی تاریخ کے اوراق پر موجود ہے۔جب 1815ء کو ''ویانا'' کا معاہدہ امن اور اس کے نتائج یاد آجاتے ہیں اور ناگزیر طور پر ان کا موازنہ 1919 کے ورسیلز معاہدہ امن اور اس کے نتائج سے کرنا پڑتا ہے۔ویانا کا معاہدہ امن کوئی خوشگوار اقدام نہیں تھا۔اس نے یورپ میں مستقبل کی جنگوں کے بیج بوئے۔سابقہ تجربات سے کچھ نہ سیکھتے ہوئے مدبرین نے ''معاہدہ ورسلز'' تشکیل دیا جو معاہدہ ویانا سے بھی برا تھا۔اس معاہدہ نے جنگ کے بعد کے برسوں پر نام نہاد امن ۔کے گہرے تاریک سائے مسلط کر دیئے۔

1919ء کے بعد کا عالمی نظام پچاس سال پہلے کی صورتحال سے یکسر مختلف اور غیر مستحکم نوعیت کا حامل تھا۔عالمی جنگ کے ساڑھے چار سال دنیا کی آبادی کے لیے عرصہ قیامت ثابت ہوئے تھے۔باقاعدہ جنگ میں آٹھ ملین لوگ ہلاک اور پندرہ ملین زخمی ہوئے تھے۔لاکھوں لوگ جنگ کے اثرات اور نتائج یعنی بیماری، قحط اور مفلسی اور فوجی تشدد سے مارے گئے تھے۔اس پورے عرصے میں 60 ملین لوگ فنا کے گھاٹ اترے جن میں آدھے روسی تھے۔اس عظیم انسانی تباہی کے نتیجہ میں لوگوں کے ذاتی رنج و الم، غم و غصے اور نفسیاتی صدمے کی کیفیت کا اندازہ کر پانا ناممکن ہے۔

پہلی عالمی جنگ کے باعث جہاں سے بہت سے معاشرے بے پناہ تباہی اور شکست وریخت کا شکار ہوئے تو دوسری طرف چند ایک محفوظ بھی رہے اور بعض نے اپنی حالت مزید بہتر کرلی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جنگ سے دور واقع ممالک تھے جن میں امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور ہندوستان شامل تھے۔ یورپ اور روس اس تباہی سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ مگر امریکہ نے اپنی تیز رفتاری کے باعث 1925ء میں مجموعی پیداوار کے اعتبار سے یورپ پر برتری حاصل کرلی۔

اس وقت عالمی کرنسی کا نظام باہمی طور پر کئی نظاموں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ اسٹرلنگ برطانیہ کے تجارتی طریقہ کار پر قائم تھا تو طلائی بلاک کی قیادت فرانس کر رہا تھا۔ مشرق بعید میں جاپان کی سربراہی میں ین تھا تو ڈالر کی سرپرستی امریکہ کر رہا تھا۔ ان سب کے برعکس روس میں کمیونزم بتدریج فروغ پا رہا تھا اور جرمنی میں خود کفالتی کا نظریہ سامنے آ چکا تھا۔ 1919ء کی ان خامیوں سے بھرپور عالمی نظام میں جو عناصر تبدیلیاں لانے پر اصرار کر رہے تھے۔ ان سے اچھی طرح نمٹنے کا جمہوری طرز عمل کسی بھی شخص کے دماغ میں موجود نہ تھا۔

1920ء اور 1930ء کے عشروں میں نظریات کی وجہ سے عالمی معاملات پیچیدہ ہوتے جا رہے تھے۔ عالمی معاشرہ بھی سیاسی گروہ بندیوں میں بٹ رہا تھا۔ اس کے نتیجہ میں اقتصادی دھڑے بندی کا عمل بھی شروع ہو گیا تھا۔ ایک طرف مغربی جمہوریتیں تھیں جہاں لوگ پہلی عالمی جنگ کے خوف میں ابھی تک گرفتار تھے تو دوسری طرف روس تھا جو دنیا کے سیاسی اور اقتصادی نظام سے یکسر الگ نظر آ رہا تھا۔ 1930ء کے عشرے میں جرمنی' اٹلی اور جاپان جیسی ریاستیں بھی تھیں۔ جنہوں نے ایک طرف بالشویک تحریک کی مخالفت کی تو دوسری طرف 1919ء میں آزاد سرمایہ۔ ان حالات میں جمہوری سیاستدانوں کے لیے خارجہ حکمت عملی کے بنیادی خدوخال وضع کرنا بہت دشوار ہو گیا تھا۔

اسی دوران مسولینی دنیا کی توجہ اپنی طرف دلانے میں کامیاب ہو گیا۔ مسولینی کی فاشسٹ حکومت نے اٹلی کو انتہائی پستی سے بلندی تک لا کر دنیا کے صف اول کے ممالک میں شامل کر دیا تھا۔ سفارت کاری کے میدان میں کامیابی کے علاوہ جدید کاری کے منصوبے بھی بنائے۔ ہوائی جہاز بنانے والا اطالوی کارخانہ دنیا بھر میں اپنی جدت کے باعث مشہور تھا۔ اٹلی نے عسکری طاقت میں بھی بلند مقام حاصل کیا تھا۔ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں اٹلی نے اپنی فوج پر بہت زیادہ رقم خرچ نہیں کی تھی۔ لیکن مسولینی کے احساس قوت' جذبہ فتح اور توسیع پسندی نے اسے اگلی دہائی میں مجموعی قومی آمدنی کا دس فیصد

عسکری معارف کی نذر کرنے پر مجبور کر دیا۔ مسولینی اکثر و بیشتر فرانس اور گاہے بگاہے برطانیہ اور فرانس دونوں سے جنگ کرنے کا تمنائی تھا۔

دوسری طرف جرمنی تاوان جنگ کی ادائیگی میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ مگر بعد کے عرصے میں خوش حالی آنے کے علاوہ سفارت کاری کے وسیلے سے بھی جرمنی کی حالت سنبھلی اور ترقی کے امکانات نے جنم لیا۔

ہٹلر کے اقدامات نے چند ہی سالوں میں یورپ میں جرمنی کی پوزیشن کافی حد تک تبدیل کر دی تھی نازی خارجہ پالیسی اصل میں جرمن قوم پرستوں اور کچلے ہوئے فوجیوں کی خواہشات و خدمات کا اظہار کرتی تھی۔ وہ جرمنی کو نیشنل سوشلسٹ ملک بنا کر ایسا معاشرہ تشکیل دینا چاہتا تھا۔ 1938ء میں مجموعی سرکاری اخراجات کا پچاس فیصد سے زیادہ حصہ ہتھیاروں کی نذر ہو رہا تھا۔

1930ء کی دہائی میں عالمی سفارت کاری کا رنگ ڈھنگ ناقابل فہم نہیں تھا۔ سیاستدان کسی معاملے کے طویل المعیاد حل اور لائحہ عمل کی بجائے ہنگامی اور فوری نوعیت کے غور و فکر کی عادت میں مبتلا تھے۔ جب جاپان کی بڑھتی ہوئی جارحیت نے برطانیہ کی رائے بدل دی، اس کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھے جائیں تو لندن کے پاس ایک ہی راستہ باقی تھا کہ لیگ آف نیشنز یا پھر کسی بڑی طاقت کی مدد سے سخت جوابی کاروائی کرے۔

لیگ آف نیشنز اپنے سبھی اصولوں کی خوبیوں کے باوجود منچوریا میں جاپانی جارحیت روکنے کے لیے کسی موثر ذریعے سے محروم تھی۔ دوسری طرف جو بڑی طاقتیں تھیں ان میں اٹلی کا کوئی مفاد مشرق بعید میں نہ تھا۔ جرمنی خاموش لیکن روس جاپانی اقدامات سے فکر مند ہونے کے باوجود دیگر طاقتوں سے نظر انداز کئے جانے کے باعث تنہا تھا اور تن تنہا آگے بڑھنے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔

فرانس بھی تذبذب کا شکار تھا۔ وہ جرمن کے بڑھتے ہوئے غلبے کو روکنے اور موجودہ حالات کو برقرار رکھنے کے حق میں تھا۔ امریکہ نے جاپان کے اقدامات کو ساری دنیا کے لیے خطرہ قرار دیا۔

1933ء میں جرمنی سے دوبارہ خطرات محسوس کیے جانے کے بعد برطانیہ، فرانس اور امریکہ کے سفارتی روابط پر کافی گہرا اثر پڑا۔ فرانسیسی حکومت نے 1935ء میں جرمنی کے خلاف اتحاد بنا لیا، اسٹالن نے امن پسند ممالک کے ساتھ مفاہمت کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سوویت یونین نے 1935ء میں انجمن اقوام میں شمولیت اختیار کرنے کے علاوہ پیرس اور پراگ کے ساتھ دفاعی معاہدہ بھی کر لیا۔

دفاعی مسائل کے حوالے سے انگلستان اور فرانس کے مابین اختلافی نظریہ اس وقت پوری طرح سامنے آیا، جب فرانس نے روس کے ساتھ رابطے بڑھائے تو لندن نے اسے شک کی نظر سے دیکھا۔ برطانیہ نے جرمنی سے ایک بحری معاہدہ کیا تو فرانس کو اذیت پہنچی۔ حبشہ پر مسولینی کا حملہ تباہ کن ثابت ہوا۔ اس سے علاقے میں جھڑپیں شروع ہوگئیں اور نئی سلطنت روما قائم کرنے کا اطالوی خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ فرانس اپنے ایک اتحادی کے دشمن بن جانے سے بھی کافی پریشان تھا۔ فرانس کو ڈر تھا کہ اٹلی کے ساتھ محاذ آرائی سے ہٹلر کو ہائن لینڈ پر دھاوا بولنے کا موقع مل جائے گا اور برطانیہ کو ڈر تھا کہ اس طرح جاپان کو ایشیاء میں پیش قدمی کا موقع مل جاتا۔

فرانس اور برطانیہ میں دفاعی تعاون کافی مضبوط ہوگیا۔ اسی دوران ممبرلین اٹلی کے معاملے میں ناکام رہا۔ جب ہٹلر نے 1939ء کے موسم بہار میں پولینڈ پر دباؤ ڈالا تو جنگ سے گریزاں رہنے والے تمام امکانات ختم ہوگئے۔ جرمنی مارچ 1939ء میں چیکوسلواکیہ کی ننھی منی ریاست کو اس کے وسائل سمیت ہڑپ کر چکا تھا۔ ایک ماہ بعد اٹلی نے البانیہ کی طرف پیش قدمی شروع کی تو عوام کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے تحت جمہوری ممالک نے ہٹلر کی مزاحمت کرتے ہوئے پولینڈ' یونان' رومانیہ اور ترکی کو ان کے تحفظ کی ضمانت دی۔ 23 اگست 1939ء کو روس اور جرمنی کے درمیان (پیکٹ) کا اعلان ہوا۔ یوں جرمنی کا دفاع اور بہتر ہوگیا اور پولینڈ پر بڑھتا ہوا دباؤ باقاعدہ حملے کے خطرے میں ڈھل گیا۔ P+1

بہت سے تاریخ دانوں کے مطابق دوسری جنگ عظیم 3 ستمبر 1939ء کو شروع ہوئی۔ پہلی جنگ عظیم بھی اس کی وجہ بنی کیونکہ اس کے بعد یورپ اور دنیا کے نقشے میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مثلاً فرانس نے اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے لیے۔ آسٹریا' ہنگری اور روس بہت سی آزاد قوموں میں بٹ گئے۔ جرمنی کو پہلی جنگ عظیم کا ذمہ دار قرار دیا گیا اور اسے اس کے قابض علاقوں سے محروم کردیا۔ جرمنی کی بری اور بحری فوج کو محدود کردیا گیا اور اس برے سلوک کو ہٹلر نے نفرت میں بدل کر اپنی قوم کو ان سے جنگ کا اعلان کردیا۔ یاد رہے کہ یہ 1914ء جیسی جنگ نہ تھی جس میں کوئی فریق غیر معمولی فنی برتری کے لحاظ سے دوسرے پر غلبہ پانے میں ناکام رہا تھا بلکہ 1940ء کی اس جنگ نے جرمنی کی عسکری صلاحیت کا رعب و دبدبہ قائم کردیا تھا۔

امن کی نازک شاخ پر اکیس سال لٹکنے کے بعد یورپ ایک بار پھر جنگ کے جہنم میں کود گیا۔ اس مہینے کے آغاز پر دس لاکھ پچیس ہزار فوج پر مشتمل جرمن قوت کا ناقابل تسخیر طوفان پولینڈ کے

بارڈر کو روندتا چلا گیا۔ 17 ستمبر کو مشرقی سمت سے روسی فوج پولینڈ میں داخل ہوئی اور پولینڈ لمحوں میں ڈھیر ہو گیا۔

حملہ بغیر اعلان جنگ کیا گیا، جسے جنرل والٹروان برافیشن نے پایہ تکمیل تک پہنایا۔ پولینڈ کے خشک اور گرم خطے پر فوج اور ٹینکوں کو پیش قدمی کرنے میں کوئی مشکل نہ ہوئی۔ پیش قدمی کے بعد نازی چیف آف سٹیٹ البرٹ فارسٹر نے وانزگ کو جرمن سلطنت میں ضم کرنے کا اعلان کیا۔

روسی فوج پولینڈ کی دفاعی فوج کو آسانی سے بچھاڑنے کے بعد 18 ستمبر کو پیش قدمی کرتی ہوئی جرمن فوج سے آملی۔ دس دن بعد پولینڈ کو تقسیم کرنے کے لیے اسٹالن نے جرمنی کے وزیر خارجہ سے ملاقات کی۔ دونوں حملہ آوروں کے مشترکہ اعلامیہ کے مطابق افواج پولینڈ میں امن وسکون اور پولینڈ کی عوام کی مدد کرنے کے لیے اس پر قبضہ کر لیں گے۔ اس کی تقسیم سے روس کو 76,500 مربع میل کا مشرقی حصہ ملے گا جس کی آبادی ایک کروڑ اٹھائیس لاکھ ہے۔ جرمنی کو پولینڈ کا مغربی علاقہ حصے میں آیا۔ جس میں دارالحکومت وارسا شامل تھا۔ وارسا جسے تین ہفتے کی خوفناک بمباری سے برباد کر دیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم میں حصہ لیتے ہوئے برطانیہ اور فرانس نے بحری راستوں کی ناکہ بندی کر دی۔ اس بار جنگ کی حکمت عملی تبدیل ہونے کی وجہ سے اتحادیوں کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ کے پہلے برس جرمنی تیل اور دیگر خام اشیاء کی قلت کا شکار رہا تھا۔ لیکن روس اور سویڈن سے آنے والے مال نے اس خلا کو بہت حد تک بھر دیا تھا۔ اٹلی کی اقتصادی حالت کے پیش نظر جرمن منصوبہ سازوں نے یہ توقع کی تھی کہ مسولینی لاتعلق رہے گا۔ پولینڈ کی معرکہ آرائی نے جرمنی کے اس اعتماد کو بہت بڑھا دیا کہ وہ اپنے حریف پر برق رفتاری سے حملہ آور ہو سکتا ہے اور اسے اپنی فضائیہ اور بری فوج پر خصوصی توجہ کا صلہ مل رہا تھا۔ لیکن ڈنمارک اور نیدرلینڈ پر اچانک حملہ کر کے ہی انہیں تباہ برباد کیا گیا۔ ناروے کی جغرافیائی پوزیشن اور برطانوی بحری قوت کے باعث ناروے شروع میں تو جرمنی اس کی سرحدوں کو پار نہ کر سکا مگر فضائیہ کی برتری کے باعث اس نے اس معرکہ میں فتح حاصل کی۔ جرمنی کی طاقت کا صحیح پتہ تب چلا جب اس کے جانباز سپاہیوں نے فرانس کے ساتھ جنگ میں اس کے پیدل سپاہ اور ٹینک بردار دستے کو نیست ونابود کر دیا۔ 40-1939ء کی معرکہ آرائیوں میں فتح نے جرمنی کے قدم چومے اور نتیجتاً تیل اور خام مال ہاتھ لگا اور اس کے دشمن برباد ہو گئے۔ برطانیہ اور فرانس ایسے مفلوج ہوئے کہ کارروائی کا حوصلہ بھی پست ہو گیا۔ یورپ میں انگریز فوج کی پیش قدمی رک گئی تھی اور جرمنی پر بمباری سے

بھی دشمن کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا۔ شمالی افریقہ' صومالیہ اور حبشہ میں انگلستان اطالوی خندقوں پر آسانی سے قبضہ کر رہا تھا مگر رومیل کی افریقی سیاہ یا جرمنی کے خطرناک طریقہ جنگ کی مدافعت نا ممکن تھی۔ جنگ کا دوسرا سال مجموعی طور پر دفاعی کامیابی کا سال تھا اور اسے حاصل ہونے والی کامیابی بہت کم تھی۔

جنگ کا رخ تب بدلا جب ہٹلر نے 1941ء میں روس پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہی وہ غلطی تھی جس نے جرمنی کو یقینی فتح سے محروم ہو گیا۔ کیونکہ اس کے بعد اس کی فضائی قوت مغرب مشرق اور بحیرہ روم یعنی تین سمتوں میں بٹ کر منتشر ہو گئی۔ روس جیسے وسیع و عریض ملک پر حملہ آور ہونا ہٹلر کو مہنگا پڑا۔ 1941ء میں سٹالن نے سائبیریا سے تجربہ کار اور موسم سرما کی شدت کا مقابلہ کرنے میں ماہر فوج بلائی۔ جس نے جرمنی کو آخر کار شکست سے دوچار کیا۔

دسمبر 1941ء میں دوسری عالمی جنگ نے نیا رخ اختیار کیا اور روسی فوجوں نے ماسکو کے اردگرد جوابی کاروائیوں کا آغاز کر دیا تو اس سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ کم از کم اس وسیع و عریض خطے میں تو جرمنی پوری طرح ناکام ہو چکا ہے۔ اگست 1941ء میں متعدد مبصرین مان چکے تھے کہ روس ایک بڑی طاقت کے طور پر اپنی آخری سانسیں لے رہا ہے' لیکن جرمنی کے اس دعوے کے باوجود کہ اس نے تیس لاکھ روسیوں کو ہلاک' زخمی اور زندہ گرفتار کیا ہے۔ سرخ فوج میں حیران کن طور پر چالیس لاکھ سے زیادہ لڑاکا سپاہی موجود تھے۔

بہر حال جب سردی کا موسم گزرنے پر جرمنی نے دوبارہ پوری قوت سے حملہ کیا تو نشانہ اسٹالن تھا۔ ہر طرف تباہی پھیل گئی۔ اس کے بعد ہٹلر کے جانثاروں نے 1943ء کے موسم گرما میں سترہ ڈویژن فوج یکجا کر کے ''کرسک'' کا گھیراؤ کیا اور جنگ عظیم دوم کی سب سے ہولناک ٹینکوں کی لڑائی شروع ہوئی۔ جرمنی کی 27 سو فوجی گاڑیوں کے مقابلے میں سٹالن کی فوج کے پاس چار ہزار سواریاں تھیں۔ اگرچہ ایک ہفتے میں آدھے روسی ٹینک تباہ ہو گئے لیکن جرمن فوج کو سخت نقصان سے دوچار کرنے والی روسی فوج اب برلن پر جوابی حملے کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ یہ ان حالات میں رونما ہونے والی نہایت اہم تبدیلی تھی۔ اسی دوران اتحادیوں نے اٹلی میں بھی کامیابی حاصل کر لی جس کی وجہ سے ہٹلر کو اپنی فوجیں واپس بلانا پڑیں۔ وہ اس پیش قدمی سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا تاکہ وہ اس بہانے اپنی فوجوں کو محفوظ مقامات تک پہنچا سکے۔ یہ درست ہے کہ دسمبر 1941ء میں جرمنی نے ماسکو پر تسلط قائم کر لیا تھا۔ لیکن

روس شکست کیسے تسلیم کرتا۔ جب کہ ہزاروں میل دور مشرق کی طرف اس کے فوجی و صنعتی یونٹ ابھی تک محفوظ اور موجود تھے۔ لہٰذا وسیع پیمانے پر معاشی نقصانات کے باوجود 1941ء میں روس نے جرمنی کے مقابلے میں چار ہزار لڑاکا طیارے زیادہ بنائے اور اگلے سال مزید دس ہزار۔ یہ سب کچھ ایک محاذ کے لیے تھا جب کہ جرمنی تین محاذوں پر بیک وقت جنگ آزما تھا۔ یہی وجہ ہے کہ 1945ء میں یوکرائن جیسے کئی محاذوں پر سوویت یونین کو بھاری برتری حاصل تھی۔ جرمنی کے مقابلے میں روس کی افرادی قوت پانچ، توپیں سات گنا اور فضائیہ سترہ گنا زیادہ تھی۔

جرمنی کا جرنیل رومیل تریپولی پہنچ چکا تھا۔ اسے حکم دیا گیا ہے کہ لیبیا میں Axis قوتوں کے نقصانات کا ازالہ کرے۔ اس کی جرمن فوج کے یونٹ جنھیں ''افریقی دستے'' کہا جاتا ہے 16 فروری 1941ء کو ساحل پر اترے۔ اس ڈویژن کو صحرا میں لڑنے کی خاص تربیت دی گئی تھی۔ لیبیا میں اطالوی فوجیں جو مارشل گرازیانی کی زیر کمان تھے۔ پچھلے کچھ ہفتوں سے انتشار کا شکار تھے۔ پچھلے مہینے اطالویوں کے ہاتھوں تبروک نکل گیا تھا اور پچھلے ہفتے برطانوی فوجوں نے بن غازی پر قبضہ کر لیا تھا۔ مسولینی نے اٹلی کے پے در پے شکستوں کے بعد اپنے چوٹی کے جنرلوں کو فارغ کر دیا۔

اسی دوران وہ واقعہ رونما ہوا جس نے امریکہ کی مداخلت کی راہوں کو کھول دیا۔ ولندیزیوں سے شرق الہند کی امداد شروع کر دی۔ اس کے علاوہ 7 دسمبر کو 360 جاپانی بمبار طیاروں نے خاموشی سے جزائر ہوائی پہنچے اور پرل ہاربر پر امریکی فوجی اڈے کو خاکستر کر دیا۔ ہزاروں ہلاک، زخمی ہوئے۔ جاپان جزائر ہوائی پر اچانک حملہ کرنے کے لیے کافی عرصہ سے پلاننگ میں مصروف تھا۔ جب کہ دوسری طرف وہ امریکہ سے جاپان کی فرانسیسی انڈوچائنا میں اپنی حالیہ وسعت اور تجارتی سمجھوتوں پر مصالحت کی راہیں تلاش کر رہا تھا۔ جو بر داز بحری آبدوزوں اور جنگی بحری جہازوں کو تباہ اور دو ہزار ملاحوں اور چار سو دوسرے افراد ہلاک ہو گئے اور تقریباً تیرہ سو زخمی ہوئے۔ اس حملے سے امریکی عوام حواس باختہ اور کچھ سوچنے سمجھنے سے قاصر تھے۔ حملے کے بعد جاپانی حملہ آور بہت کم نقصان اٹھائے ڈرامائی انداز میں فرار ہو گئے۔ ان کے صرف انتیس جہاز اور پانچ چھوٹی آبدوزیں تباہ ہوئیں۔ جاپانی تاریخ میں اس ملٹری کارنامے کو بہت بڑی کامیابی مانا جاتا ہے۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جاپان کی فوجی قیادت نے محض چین کے واقعہ کی آڑ میں نہایت بڑے پیمانے پر کاروائی کرنے کی منصوبہ بندی کر لی تھی۔ ان واقعات کے علاوہ ہٹلر نے امریکہ کے

خلاف جنگ کا اعلان کر کے دنیا کے سب سے طاقتور ملک کو معرکہ آرائی میں کودنے پر مجبور کر دیا۔اس ریاست کے صنعتی علاقے دشمن کی رسائی سے بہت دور تھے۔اس طرح اسے پوری طرح اپنی فوجی صلاحیتوں کو بڑھانے کے مواقع میسر آ گئے۔

برطانیہ کے وزیر اعظم چرچل نے دوسری جنگ عظیم میں امریکہ کے ملوث ہونے کی خبر پر خوش ہو کر کہا تھا "ہٹلر کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا" مسولینی کا باب بھی بند ہوا،اور رہے جاپان والے تو وہ ریزوں کی صورت میں بکھر جائیں گے۔" جرمنی روس میں ابتدائی طور پر ناکام رہنے کے بعد سردی گزر جانے پر حملہ آور ہو چکا تھا۔شمالی افریقہ میں سکندریہ محض پچپن میل دور تھا۔امریکی اور برطانوی بمباری بھی اپنا غیر معمولی جنگی کردار کامیابی کے ساتھ ادا نہ کر سکی بلکہ اکثر طیاروں میں سوار عملہ جان کی بازی ہار جاتا۔

مئی 1942ء میں بحر الکاہل میں جاپانی بحری پیش قدمی روک کر اتحادیوں نے اپنی بالادستی ثابت کی۔امریکہ کی بحری طاقت اور معاون جوابی کاروائی کے لیے پوری طرح تیار ہو چکے تھے۔دوسری طرف اکتوبر 1942ء میں رومیل کے فوجی دستے کو تیونس کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا۔اگلے ماہ مزید ایک لاکھ امریکی و برطانوی فوج شمالی افریقہ کے فرانسیسی علاقے میں پہنچے اور یوں جرمنی اور اٹلی کی افواج کے خلاف مغربی سمت سے کاروائی شروع ہوئی۔

25 جولائی 1943ء کو مسولینی کو گھر میں نظر بند کر دیا گیا اور اٹلی کے شاہ وکٹر ایمونیل نے مارشل پیترو بدوگلیو کو حکومت بنانے کی دعوت دی۔اس مہینے کے آغاز پر اتحادیوں کی سسلی پر چڑھائی اور پچھلے ہفتے روم میں بمباری مسولینی کی آخری بربادی تھی۔اٹلی کے عوام بے چینی اور مایوسی کا شکار تھے جب کہ مسولینی نے ہٹلر سے اتحاد کر لیا تھا۔لیکن جب ان کے ملک پر حملہ کیا گیا تو وہ پر احتجاج ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ پارٹی میں مسولینی اور اس کے مستقبل کے بارے میں اختلاف پیدا ہو گئے تھے۔صدر روز ویلٹ اور چرچل کی اس اپیل پر کہ فاشزم کو اٹلی میں دفن کر دو،اس کے مخالفین کا حوصلہ بہت بلند ہوا۔مسولینی کے داماد کاؤنٹ چیانو جس نے جرمنی سے اتحاد میں اہم کردار ادا کیا بدل گیا اور اتحادیوں سے امن قائم کرنے کی اپیل کی۔اس طرح مسولینی کے لیے بہت سی مشکلات پیدا ہو گئیں۔

جس کے نتیجے میں مئی 1943ء میں دشمنوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔1943ء میں اتحادیوں کی فضائی اور بحری طاقت نے جرمنی کو شکست کی طرف دھکیل دیا۔28 نومبر 1943ء کو روز ویلٹ' چرچل اور جوزف سٹالن آج پہلی مرتبہ تہران میں اکٹھے ہوئے۔ان کے وزراء خارجہ ماسکو میں جنگ کے بعد کی

صورت حال پر بنیادی سمجھوتوں پر متفق ہو چکے تھے۔ تینوں لیڈروں میں صرف باہمی تعلقات کے امور باقی رہ گئے تھے۔ تینوں لیڈروں میں جب باہمی تعلقات قائم ہو گئے تو پھر وہ اصل معاملات کی طرف آئے۔ ماسکو میں وزراء خارجہ کی میٹنگ میں روسی وزیر خارجہ مولوتوف کو یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ دوسرا محاذ جلد کھول دیا جائے گا جس کا اسٹالن عرصے سے مطالبہ کر رہا تھا تاکہ جرمن فوجوں کی توجہ روس سے ہٹ کر دوسری طرف ہو جائے اور روس پر جنگ کی شدت کم ہو سکے۔ تہران میں تینوں لیڈروں نے اتفاق کیا کہ آپریشن جسے Overlord کا نام دیا گیا تھا اگلے سال مئی میں آغاز کیا جائے گا۔

یہ بھی معاملہ زیر بحث آیا کہ جنگ کے بعد جرمنی کو کیسے تقسیم کیا جائے۔ اس کے علاوہ وہ پولینڈ کے حساس مسئلے پر ایک ابتدائی سمجھوتے پر متفق ہو گئے۔ اسٹالن کو یقین دلایا گیا کہ روس کو مغرب کی طرف سے سرحد بنانے کی اجازت ہو گی جب کہ پولینڈ کو اس کے بدلے جرمنی کا مشرقی حصہ دیا جائے گا۔ اسٹالن نے دونوں لیڈروں کو بلقان کے بارے میں اپنے ارادوں اور بحرالکاہل میں گرم بندرگاہ کے حصول کے بارے میں اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

بالآخر 25 اگست 1944ء کو فرانسیسیوں نے اپنا ملک نازیوں کے قبضہ سے آزاد کرا لیا۔ فرانسیسی پیرس کی گلیوں اور ریستورانوں میں اپنا قومی ترانہ گا رہے تھے' سرکاری عمارتوں پر ترنگا شان و شوکت سے لہرا رہا تھا اور جنرل چارلس ڈیگال کی قیادت میں پیرس میں پریڈ ہو رہی تھی۔ امریکی دستے ابھی نہ پہنچ سکے۔ فرانسیسیوں کا سر فخر سے بلند ہوا کہ انہوں نے اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر لیا۔ فرانس کو آزاد کراتے وقت یہ خیال رکھا گیا کہ پیرس برباد نہ ہو اور اس کے تاریخی اثاثے محفوظ رہیں۔ اس کوشش میں کافی حد تک کامیابی ہوئی اور شہر میں خون خرابہ نہ ہوا۔ جنرل وان خولٹر نے ہٹلر کے اس حکم کو نظرانداز کر دیا کہ پیرس کو آگ لگا دی جائے' اس نے خاموشی سے ہتھیار ڈال دیئے۔

28 اپریل 1945ء کو میلان میں ایک زرد اور مسخ چہرے اور گولیوں سے چھلنی سر کے ساتھ اس کا جسم لاشوں کے ڈھیر پر پڑا تھا۔ یہ سڑی ہوئی بدبودار لاش فاشزم کے بانی مسولینی کی تھی۔ ایک سرسری اور فوری مقدمے کے بعد اور مسولینی کی پر احتجاج اور زوردار آواز "مجھے زندگی دو تمہیں سلطنت دوں گا" کے بعد اپنی محبوبہ کے ساتھ گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

مسولینی 1919ء میں فاشسٹ پارٹی کی تشکیل کے بعد اقتدار کے ایوانوں میں داخل ہوا۔ جاگیرداروں اور فوجی افسران کی ... تحریک زور پکڑتی گئی

1922ء وکٹر ایمونیل سوم نے مسولینی کو اقتدار سونپا۔ 1930ء میں مسولینی نے اپنی نظریں اٹلی سے باہر گاڑیں اور دوسری دائیں بازو کی حکومت سے اتحاد کیا جس میں اسپین کا فران کو اور جرمنی کا ہٹلر شامل تھا۔ جرمنی کے فرانس پر قبضے کے بعد تمام یورپ فتح کرنے کے جنون میں وہ ہٹلر کے ساتھ جنگ میں شامل ہو گیا۔

یکے بعد دیگرے فوجی شکستوں سے فاشسٹوں میں اختلاف پیدا ہو گئے اور 1943ء کے وسط میں بادشاہ اور مسولینی کو گرفتار کر لیا گیا۔ نازیوں نے آزاد کرا لیا لیکن اتحادی فوجوں کی پیش قدمی سے مسولینی فرار ہونے پر مجبور ہو گیا۔ انقلابی اطالویوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ مقدمہ چلایا اور پھر گولی مار دی۔ اس کی لاش کو میلان لے جایا گیا۔ جہاں اسے الٹا لٹکا دیا گیا۔ کیمرے کے سامنے اس کے سر کو رائفلوں کے بٹ مار کر مسخ کر دیا گیا۔

30 اپریل 1945ء کو دوسری جنگ عظیم کا سب سے اہم واقعہ تب رونما ہوا جب ہٹلر نے غیر یقینی طور پر خودکشی کر لی۔ اس نے جرمنی کی شکست کو بھانپتے ہوئے برلن میں یہ قدم اٹھایا۔ روسی دستے جونہی شہر کے وسط میں پہنچے ہٹلر نے اپنے خفیہ بنکر میں اپنی محبوبہ ایوبران سمیت خودکشی کر لی۔ ان کی لاشوں کو بنکر سے باہر جلا دیا گیا۔ ہٹلر کی فوجی فتوحات نے اسے ضرورت سے زیادہ پر اعتماد بنا دیا جو بالآخر نازیوں کے زوال کا سبب بنا۔ اتحادی اس کے زوال پذیر دفاع کو روندتے چلے گئے اور بالآخر نازی ازم کے فنا ہونے کے بعد روڈلف ہٹلر جو کبھی اتنا طاقتور تھا، راکھ میں مل گیا۔

ہٹلر کی موت کے بعد جرمنی لڑنے کے قابل نہ رہا تو بالآخر 7 اپریل 1945ء کو جرمنی اتحادیوں کے مطالبات کے آگے جھک گیا۔ جرمنوں نے دانستہ طور پر دستخط کرنے میں تاخیر کی تاکہ زیادہ سے زیادہ فوجی اور پناہ گزین اپنے آپ کو روسیوں کی بجائے مغربی اتحادیوں کے حوالے کر سکیں۔ لیکن تین دن بیشتر ہی سب ختم ہو گیا۔ جب فیلڈ مارشل منٹگمری کے آگے شمال مغربی جرمنی ہالینڈ اور ڈنمارک کی جرمن فوجوں نے سرنڈر کر دیا۔ ناروے کی جرمن فوج نے ایک دن پہلے ہتھیار ڈالے۔

دوسری طرف جاپان بڑی بہادری سے لڑ رہا تھا۔ مگر ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے جانے کے بعد اور پچھلے ہفتے مانچوریا پر روسی حملے کے بعد جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے۔ بالآخر جاپان پوٹسڈم کانفرنس کی شرائط پر متفق ہو گیا جس کے نتیجے میں اتحادی فوجیں جاپان پر اپنا تسلط اور فوج کو غیر مسلح کر دیں گی۔

اب ہم ان باتوں کو دیکھتے ہیں جو جرمنی اور جاپان کی ناکامی کا موجب بنیں۔ ان دونوں ملکوں کی

قیادت نے 1941ء کے بعد فوجی اور سیاسی غلطیاں کیں جو انہیں مہنگی پڑیں۔ جرمنی نے فوجی ڈویژن بہت چھوٹے پیمانے پر قائم کئے اور سوویت یونین اور یوکرائن میں اقلیتوں کے ساتھ بے رحمی اختیار کی جب کہ وہ سٹالن کے شکنجے سے آزاد ہونے کے بعد خوش تھیں۔ محکموں میں اعلیٰ عہدوں پر نااہل لوگوں کو تعینات کرنے پر کچھ لوگ دبی آواز میں ہٹلر کی خلاف ورزی کرنے لگے اور اسی وجہ سے پالیسیوں میں وہ تسلسل نہ رہا۔ جاپانی بحریہ نے بھی بہت سی غلطیاں کیں جن کے باعث بحرالکاہل میں حاصل بالادستی جاتی رہی اور 43-1941ء کے دوران جاپان نے تباہ کن جہاز تیار کرنے کی طرف بالکل توجہ نہ دی حالانکہ امریکہ میں ایسے 131 جہاز تیار ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ خفیہ پیغامات کے حوالے سے بھی جاپان کا رویہ بے نیازی والا تھا۔

تمام ملک اسلحہ سازی میں بالادست تھے۔ لیکن صورتحال میں فیصلہ کن تبدیلی تو اس وقت آئی جب 1941ء سے 1943ء کے دوران امریکہ میں آٹھ گنا زیادہ اسلحہ سازی ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جرمنی نے آخری دم تک مزاحمت کی لیکن آخرکار اسے اتحادیوں کی جنگی صلاحیت کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ 1945ء میں تو یہ حالت تھی کہ امریکہ اور برطانیہ کے ہزاروں طیارے سلطنت جرمنی پر بموں کی بارش کرنے لگے۔ دوسری طرف سوویت یونین کی سینکڑوں ڈویژن فوج برلن اور ویانا کو تباہ کرنے کے لئے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پیچیدہ اور مشترکہ جنگ میں وہی فاتح ٹھہرے جو مالی استحکام کے حامل تھے۔ جاپان کی شکست کی وجہ بھی یہی تھی۔ دوسرا 1945ء میں ایٹم بم کے حملے کا معاملہ دنیا کی فوجی تاریخ میں اہم ترین موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس حملہ کے بعد جاپان میں مزید لڑنے کی ہمت نہ تھی۔ اس طرح دوسری جنگ عظیم کروڑوں لوگوں کو موت کی نیند سلا کر اختتام کو پہنچی۔

نسل پرستی اور نظریات کی جنگ

آج تک دنیا میں کئی نظریات نے جنم لیا۔ان نظریات کے پیروکار ہر زمانہ میں پائے گئے جن کی وجہ سے ہر نظریہ کو بڑی پذیرائی ملی۔

نسل پرستی کا نظریہ کئی ہزار سالوں پر محیط ہے۔قدیم زمانہ میں یونانیوں اور رومیوں کا خیال اور سوچ تھی کہ وہ دوسری اقوام مثلاً ایرانیوں' مصریوں اور جرمنوں سے شکل وصورت اور ذہنی لحاظ سے فطری طور پر اعلیٰ ہیں۔ان نظریات کو تقویت ارسطو کے اس نظریہ سے ملی جس میں اس نے کہا کہ" کچھ لوگ فطرت کی جانب سے غلام پیدا ہوتے ہیں تا کہ وہ یونانیوں کی خدمت کر سکیں۔" اسی طرح قدیم زمانے میں جس دوسری قوم نے دوسروں کو کمتر اور خود کو اعلیٰ تصور کیا وہ یہودی تھے۔وہ خود کو خدا کی پسندیدہ قوم کا درجہ دیتے تھے۔اس طرح وہ دوسری اقوام کے لوگوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنانے کے ساتھ ساتھ انہیں انسانی درجہ بھی نہ دیتے تھے پھر ان کے ضمیر کو اس سے کوئی تکلیف نہ ہوئی کیونکہ ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ یہ سب کچھ خدا کی رضا سے ہے۔

مؤرخ علی نسل پرستی کے متعلق لکھتے ہیں کہ نسل پرستی کا جذبہ معاشرہ میں نہ تو فطری ہے اور نہ ہی مستقل یہ ایک غیر فطری تخلیق ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے غیر مساوی درجہ بندی کو مستقل طور پر قائم کیا جائے۔قوموں کی پسماندگی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وسائل کی تقسیم مساوی بنیادوں پر نہیں ہے۔اس وجہ سے نسل پرستی اور پسماندگی دونوں کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے اور ان کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ معاشرہ کے ایک طبقہ کو وسائل کی پہنچ سے دور رکھا جائے۔نسل پرستی اور تعصب میں بڑا گہرا رشتہ ہے۔تعصب کو آسانی کے ساتھ اس طرح

سے بیان کیا جا سکتا ہے کہ یہ جذباتی رجحان اور رائے ہے جو کہ نفرت پر ہوتی ہے اور یہ کسی چیز کو جانے اور سمجھے بغیر اس کے بارے میں اختیار کر لی جاتی ہے لیکن نسل پرستی کی تعریف اتنی آسان نہیں اور اسکی بہت سی تعریفیں اس قدر متضاد ہیں جس طرح خود نسل کی۔ لیکن عام طور پر سب اس بات پر متفق ہیں کہ نسل پرستی جیسی بھی ہو' اس کی بنیاد طاقت و تعصب پر ہوتی ہے۔ جب اس طاقت کو تیسری دنیا کو پسماندہ رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ تو نسل پرستی ایک آلہ بن جاتی ہے۔

جب قوموں یا نسلی گروہوں میں دو قسم کے تعلقات ہوں تو اس صورت میں ان میں مقبول عام قسم کے تعصبات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تعصّبات جہالت اور خوف کی وجہ سے ابھرتے ہیں۔ اور ان کے پس منظر میں ان کے جسمانی اور ثقافتی اختلافات بھی ہوتے ہیں۔ نسل پرستی کے رجحانات ان معاشروں میں زیادہ پیدا ہوتے ہیں کہ جو نسلی طور پر رجعت پرست ہوں او رتمام مراعات و اختیارات چند لوگوں کے ہاتھ میں ہوں۔ اس قسم کے معاشرے قومی اور نسلی اختلافات سے ڈرتے ہیں اور ان کا نسلی تعصب انہیں اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ وہ خود کو پاک وصاف اور محفوظ رکھ سکیں گے اور اپنے اتحاد کو برقرار رکھ سکیں گے۔ 17 ویں اور 18 ویں صدی کا انگلستان اس کی بہترین مثال ہے کہ جس میں غیر عیسائیوں کو گمراہ سمجھا جاتا تھ اور اس لیے عیسائیوں سے کم تر۔ اسی نظریہ نے یہودیوں کو حقیر بنا دیا اور انہیں حضرت عیسیٰ کی موت کا ذمہ دار سمجھ کر ہمیشہ کے لیے ذلیل سمجھا گیا۔ اس طرح مغربی کلچر میں یہ روایت تھی کہ کسی جماعت اور گروپ کو ان کی نسل اور کلچر کی بنیاد پر برا سمجھا جائے اور ان کے مقابلہ میں عیسائی کلچر کو برتر مانا جائے۔ اس نظریہ کو مزید موثر اور فروغ ڈارون نے دیا۔

روبن ہولڈر نسل پرستی کے متعلق لکھتے ہیں کہ 1778ء میں انگریز نسل پرستی کا اتنا بوجھ اپنے ساتھ لائے کہ وہ آسٹریلیا کے براعظم کو ڈبونے کے قابل تھا۔ اور یہ بوجھ لانے والے کون تھے؟ وہ ایک ہزار سفید فام کہ جن میں دو تہائی برطانوی معاشرے کے پست ترین لوگ تھے اور جن کے لئے برطانیہ میں زندگی مفلسی، گندگی اور وحشیانہ پن کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی۔

آسٹریلیا کے مقامی باشندوں کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہاں سفید فام لوگوں کے ساتھ کسی بھی طرح رہ سکیں کیونکہ ان کے طرز زندگی اور شکاری میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اہل برطانیہ مقامی لوگوں کے رسم

ورواج اور عادات سے قطعی بے خبر تھے اور ان میں مشترکہ زندگی گزارنے کا جو طریقہ تھا' وہ ان کے لیے اجنبی تھا۔ اور چونکہ ان آنے والوں میں تمام مرد تھے اس لئے انہوں نے مقامی عورتوں کو اغوا کرنا، غلام بنانا اور ان کی عزت لوٹنا شروع کر دی۔

جیسے جیسے کالونی کا دائرہ بڑھتا گیا' ایسے ایسے نو آباد کار جارحانہ رویہ اختیار کرتے گئے' اور مقامی لوگوں کے خلاف انتقامی کارروائیاں تیز ہو گئیں۔ نو آباد کاروں کو مسلح کر کے فوج کے ساتھ مقامی لوگوں کے خلاف لڑایا گیا۔ چونکہ مقامی لوگوں کو بادشاہ کی رعایا قرار دے دیا گیا تھا، اس لئے ان کی ہر مزاحمت کو بغاوت کا نام دیا گیا۔ اور ایسی تمام بغاوتوں کو سختی کے ساتھ کچل دیا گیا۔ چونکہ ان مقامی لوگوں کا نہ تو حق ملکیت تسلیم کیا گیا اور نہ انہیں قوم منایا گیا۔ اس لئے ان کے خلاف رسمی طور پر نہ کوئی اعلان جنگ ہوا اور نہ ہی ان سے کسی قسم کے معاہدے کئے گئے۔

جیسے ہی خوں ریز مزاحمت ختم ہوتی' بے گھر مقامی باشندوں کو محض ایک دیہاتی گندگی سمجھ کر ان کا قتل عام کیا گیا۔ اس مرحلہ پر مشنری آئے تا کہ اس مرتی ہوئی نسل کو روحانی تسکین بہم پہنچا سکیں' حکومت نے ان کے لیے اجتماعی کیمپ ہیں کہ جہاں ان کی حالت قیدیوں کی سی ہے۔ ان کیمپوں میں مقیم باشندوں کو کسی بھی آسٹریلیا کی ریاست میں کوئی مقیم باشندوں کو کسی بھی آسٹریلیا کی ریاست میں کوئی حقوق نہیں۔ ان کا سفید فام منیجر ان کے لیے ایک آمر کی طرح ہے۔ وہ کسی کا بھی داخلہ بند کر سکتا ہے اسے باہر جانے سے روک سکتا ہے اور کسی کو بھی سزا کے طور پر اس سے خارج کر سکتا ہے۔ اس کا کام ہے کہ وہ یہاں شادی کرائے۔ باہر سے تمام رابطوں کی دیکھ بھال کرے۔ بچوں کو ان کے والدین سے جدا رکھتے مزدوروں کو مقررہ اجرت پر کام کی اجازت دے۔

اس طرح یہ منیجر ان کی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہوتا ہے۔ حفاظت کہ یہ جنگیں سفید فام زمین کے مالکوں کو سستی مزدوری فراہم کرتی ہیں اور ان کی عورتوں کیساتھ جنسی تعلقات کی کوئی سزا نہیں ہوتی۔ ویلفیئر بورڈ جو ان حفاظت کی جگہوں کی دیکھ بھال کرتا ہے' جب چاہے انہیں بند کر کے یہ زمین کاشت کے لیے دے سکتا ہے۔

1950ء کی دہائی میں حکومت نے ایک پالیسی وضع کی کہ جس کے ذریعہ مقامی لوگوں کو اپنے میں ضم کیا جائے' مقامی لوگوں کے نقطہ نظر سے یہ ایک دوسرا قتل عام تھا' کیونکہ اس کا

مطلب تھا کہ مقامی باشندے سفید عام معاشرے میں اس طرح سے مل کر ختم ہو جائیں کہ جیسے ان کا کبھی وجود ہی نہ تھا اور نہ ان کی علیحدہ سے کوئی ثقافت تھی۔ اس عمل کے تحت دوغلی نسل کے بچوں کو زبردستی ان کے والدین سے علیحدہ کر لیا جاتا تھا۔

وہ تمام علاقے کہ جن میں سفید فام باشندے آباد تھے وہاں مقامی باشندوں کی زبان اور ثقافت کو بری طرح سے کچلا گیا۔ اور ان کی ثقافت کو آج تک نہ تو سمجھنے کی کوشش کی گئی اور نہ اس کی حفاظت کی طرف توجہ دی گئی بلکہ اسے برا بھلا کہا گیا اور مقبر سمجھا گیا۔ ماہر علم بشریات اور مورخوں نے مقامی باشندوں اور ان کے معاشرہ پر لاتعداد کتابیں لکھیں جن میں انہیں ''جدید زمانے میں پرانے زمانے والے لوگ'' کہا گیا اور ان کے خلاف نسل پرستی کے جذبات کو ہوا دی گئی۔ آسٹریلوی معاشرہ کے ہر پہلو میں نسل پرستی رچی ہوئی ہے' پریس میں مقامی باشندوں کے بارے میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ وہ شرابی اور کام چور ہیں' اور حکومت کی امداد پر زندگی گزارتے ہیں' اکثر دائیں بازو کی جماعتوں کا خیال ہے کہ انہیں کسی جزیرہ پر جمع کر کے بم سے اڑ دیا جائے اور ایسا کیا بھی گیا جب 1952ء سے 1963ء تک برطانیہ نے اپنے جوہری ہتھیاروں کو جنوبی آسٹریلیا میں ٹیسٹ کیا' اس کے نتیجہ میں تقریباً 5 سو مقامی باشندے ہلاک ہوئے۔

نسل پرستی کا اظہار آسٹریلیا میں ان حالات سے ہوتا ہے کہ جس میں سفید فام اور مقامی باشندے رہتے ہیں' سفید فام باشندوں کی صحت و صفائی کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی ہے' جب کہ مقامی باشندے غربت و گندگی میں زندگی گزارتے ہیں' اس وجہ سے عمر کے تناسب میں سفید اور مقامی باشندوں میں بڑا فرق ہے۔ ساٹھ فیصد مقامی باشندے دواؤں کو خریدنے کی قوت نہیں رکھتے ہیں۔ بچوں کی اموات ان میں تین گنا زیادہ ہے۔ سڈنی کے خوبصورت شہر میں 25 فیصد مقامی بچے غذا کی کمی کا شکار ہیں یہی کچھ صورتحال آسٹریلیا کے ہر علاقے میں ہے جہاں یا تو یہ بیماریوں میں مبتلا ہیں' یا غذا کی کمی کا شکار ہیں۔

اکثر مقامی باشندے کے اور خستہ مکانوں میں رہتے ہیں اور تمام آسٹریلیا میں مقامی باشندے پلوں کے نیچے' باغات میں دریا کے کناروں پر پائے جاتے ہیں' بہت سے مقامی باشندے سوشل سیکورٹی کے سہارے زندہ رہتے ہیں، ان میں بیروزگاری کی شرح سفید فام لوگوں کے مقابلے میں چھ گنا ہے' اگر

انہیں ملازمت ملتی بھی ہے تو ان کی تنخواہ کی شرح کم ہوتی ہے۔

مقامی باشندوں اور قانونی نظام کے درمیان ہر پہلو میں تضاد ہے۔ جرائم کے قانون کے تحت سب سے زیادہ سزائیں مقامی باشندوں کو ملتی ہیں' وہ مقابلتاً تیرہ گنا جیل میں جاتے ہیں' ان کی عورتیں جیل کی آبادی کا تیسرا حصہ ہیں۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ ''مقامی'' باشندے مجرم ہیں کیونکہ وہ کالے ہیں۔

ایسا ہی ایک نظریہ ارتقاء اٹھارویں صدی میں ڈارون نے پیش کیا۔ ڈارون 12 فروری 1809ء کو انگلستان میں پیدا ہوا اس کے باپ کی خواہش تھی کہ وہ کلیسا سے رشتہ قائم کرے اور پادری بنے لیکن اس کے مقدر میں کچھ اور بننا لکھا جا چکا تھا اس پر مذہب دشمنی' انسان کی قدر و قیمت گھٹانے کے الزامات اور فتوے لگے۔

1831ء میں شاہ برطانوی بحریہ نے ایک جہاز جنوبی امریکہ اور پھر ساری دنیا کے مطالعاتی دورے کے لیے روانہ کیا۔ ڈارون کو بطور نیچرسٹ اس مشن میں شامل کر لیا گیا۔ اس دوران ڈارون حشرات الارض پودے' نباتات' نوادرات اور ارضیات نمونے جمع کرتا رہا اس طویل بحری مشاہداتی اور مطالعاتی دورے کے دوران اس کی اشاعت نے اس پر شہرت کے دروازے کھول دیئے اس واپسی پر 1839ء میں ایک رسالہ شائع کیا جس سے متعلقہ علوم کے دروازے کھلے۔

1843ء میں ''اصل الانواع'' کا مسودہ شائع ہوا اور ڈارون نے دیکھا کہ اس کے بہت سے مداح اس کے خلاف تنقیدی اور مخالفانہ مضامین لکھ رہے تھے' اس نے اس کتاب میں ارتقاء کا نظریہ انسان کے لیے بھی پیش کیا اور کہا کہ صدیاں گزرنے کے بعد انسان اپنی اصل کتاب میں آیا ہے۔ اس نے لکھا کہ انسان کا ارتقاء بندر نما مخلوق سے ہوا۔

اس نے کتاب میں لکھا:

''نوع حیوانات کی مختلف نسلوں کی فنا و بقا کا انحصار ان حالات پر بھی ہوتا ہے جن میں انہوں نے جنم لیا ہوتا ہے اور پرورش پائی ہوتی ہے۔ موسم آب و ہوا اور ماحول اور قوت ان کی نشو و نما ارتقاء پر انداز ہوتے ہیں۔ صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ اس عمل نشو و نما پر کچھ اس طرح فرق پیدا ہوتا ہے کہ ان حیوانات کی جسمانی ساخت اور شکل اور صورت پہلے جیسی نہیں رہتی بلکہ

اس میں کچھ تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں ان تبدیلیوں اور تغیرات کی ذمہ داری طاقت اور حالات پر عائد ہوتی ہے۔ انسان اپنی موجودہ جسمانی ساخت شکل وصورت سب اپنے تجرباتی مراحل سے گزرنے کے بعد حاصل کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ انسان پہلے اپنی جسمانی ساخت اور شکل وصورت کے لحاظ سے اپنی موجودہ حالت سے قطعی مختلف ہوا کرتا تھا۔"

اس نے نسلی تعصب کو خوب فروغ دیا اور مختلف نسلوں کو مختلف گروہوں میں بدل دیا اس کا نظریہ تھا کہ یورپین انگریز لوگ دنیا کی سب سے اعلیٰ نسل ہے۔ ڈارون کے نظریات سے تقریباً دوسوسال قبل سولہویں صدی میں یورپین ممالک نے دوسرے ممالک تک رسائی حاصل کرنے کے لیے تگ ودو شروع کر دی۔ سپینی جہاز ران کرسٹوم کولمبس نے 3 اگست 1492ء کو اپنا بحری سفر شروع کیا ان کا پہلا قیام افریقہ کے ساحل پر کیزی کے جزیروں پر ہوا 6 ستمبر کو وہ یہاں سے مغرب کی سمت چل دیئے اور 12 اکتوبر 1492ء کو انہوں نے امریکہ دریافت کر لیا۔

امریکہ کی دریافت کے تھوڑے سے عرصے بعد سپین نے جنوبی امریکہ پر فتح کے دروازے کھولے۔ انہوں نے وہاں کے لوگوں کو غلام بنالیا اور ان کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا یہ امن پسند لوگ تھے جب ان میں سے کچھ لوگوں نے سپین کے مظالم کے خلاف آواز بلند کی تو ان کی آواز کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔

سپین کے بعد ہالینڈ اور برطانیہ سے بھی دنیا کے دوسرے خطوں کو فتح کر کے وہاں اپنی کالونیاں بنانے کا منصوبہ بنا۔ انیسویں صدی میں برطانیہ دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے طور پر سامنے آئی جہاں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ جنوبی ایشیا سے لاطینی امریکہ تک برطانیہ نے تمام قدرتی وسائل کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ یورپین لوگ دوسری اقوام کو اپنے آپ سے کمتر سمجھتے تھے اور ان سے جانوروں جیسا سلوک کرتے تھے اس کی بنیاد ڈارون کے نظریہ نے رکھی۔ اس کے یورپین لوگوں کو سب سے اعلیٰ قرار دیا جس نے کو روا ہوا دی اور طاقتیں دوسری پست قوموں پر چڑھ دوڑی اس کی بہترین مثال ملکہ وکٹوریہ ہے جو ڈارون کے نظریات کی قائل تھیں۔ انہیں علم وفن کا بڑا سرپرست تسلیم کیا جاتا تھا لیکن ملکہ وکٹوریہ بھی کلیسا کی مخالفت مول لے کر اسے "سر" کا خطاب دینے سے ساری عمر ہچکچاتی رہیں۔

چنانچہ نسل پرستی کے نظریہ کو فروغ دینے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ سفید اقوام ذہنی جسمانی

طور پر برتر و افضل ہیں۔ اس زمانہ میں کھوپڑیوں کو جمع کرنے کا شوق ہوا اور اس سلسلہ میں ہر نسل کے لوگوں کی کھوپڑیاں دنیا بھر سے جمع کی جانے لگیں اور ان کے سائز کو دیکھ کر کسی نسل کی ثقافتی اہمیت کو ثابت کیا جانے لگا۔ ایک یورپی کھوپڑی کے تجربہ کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ اس کا وزن سائنس اور اعلیٰ خیالات کے لیے موزوں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کھوپڑی کی شکل پر اس قدر زور کیوں دیا گیا؟

اس کا جواب ہم خود دے سکتے ہیں' اگر کھوپڑی کی بجائے سر پر بالوں کی تعداد سے تہذیب وثقافت کا اندازہ لگایا جاتا' تو اس صورت میں کالی اقوام سب سے اعلیٰ قرار پاتیں اور سفید اقوام کو بالکل نچلے درجہ بندوں کے ساتھ جگہ ملتی۔ نسل پرستوں نے ڈارون کے نظریہ ''طاقت ور کی بقاء'' کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا اور ثابت کیا کہ صرف سفید اقوام ہی دنیا کے فطری حکمران ہیں اور نمایاں خصوصیت ان کی ہڈیوں کی بناوٹ میں ہے۔ یورپی ارتقاء کے عمل میں دوسری قوموں سے آگے ہیں اور جب دوسری چھوٹی اقوام تباہ ہو جائیں گی تو صرف سفید اقوام اس جدوجہد میں باقی بچیں گی۔ اس نظریہ کی وجہ سے کم تر درجہ کی اقوام کا قتل عام جائز ہوتا ہے۔ اس لیے سفید اقوام نے تہذیب کے نام پر ریڈ انڈین اور آسٹریلیا کے مقامی باشندوں کا قتل عام کیا۔ کیونکہ بحیثیت کم تر نسل انہیں نیست و نابود تو ہوتا ہی تھا۔ لہٰذا کیوں نہ اس عمل کو تیز تر کیا جائے اور سفید اقوام کے لیے جگہ پیدا کی جائے۔

ایلین انٹر ہالٹر اس بارے میں لکھتے ہیں کہ نسل پرستی ریاست کی جانب سے تشکیل دی ہوئی اس پالیسی کا نام ہے جس کے تحت سفید نسل کے اقتدار کو قائم رکھا جائے اور اس کے لیے معاشی مفادات کو حاصل کیا جائے۔ جنوبی افریقہ میں جہاں کہ سفید فام اقلیت نے اپنے سیاسی اقتدار اور معاشی استحصال کے لیے اسے اختیار کیا ہے اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سیاہ فام اکثریت کو کچل کر رکھا جائے ان کی معاشی ترقی کو اس قدر رد کیا جائے کہ وہ ان کی شرائط پر کم مزدوری پر معدنیات کی کانوں' کھیتوں اور فیکٹریوں میں کام کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ ان کی زمینوں پر قبضہ کرنے کی غرض سے وقتاً فوقتاً انہیں دھکیلنے کی پالیسی پر عمل ہوتا رہا اور انہیں محفوظ علاقوں میں منتقل کیا جاتا رہا ہے۔ سیاسی اور معاشی طور پر سیاہ فام آبادی کو مکمل کنٹرول میں رکھنے کی غرض ہے۔ ''پاس سسٹم'' جاری کیے گئے تاکہ ان کی

آمدورفت پر پابندی عائد کی جاسکے۔

دنیا کی تاریخ میں یوں تو بہت سے ظلم ہوئے ہیں۔مگر جس غیر انسانی احساسات کے ساتھ نسل پرستی کی بنیاد پر جنوبی افریقہ میں سیاہ فاموں کو کچلا گیا ہے اس کی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔

اعلیٰ قوم کا نظریہ صرف برطانوی لوگوں کے ذہنوں میں نہ تھا دوسری طرف جرمن بھی اس کے دعویدار تھے جرمنی میں اس نظریہ کو زیادہ تقویت پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر ملی۔ہٹلر نے اقتدار سنبھالتے ہی جرمنوں کو باور کروانا شروع کر دیا کہ وہ دنیا کی سب سے زیادہ ذہین اور اعلیٰ قوم ہے وہ ایک پرجوش اور اعلیٰ لیڈر تھا جو جرمن کو اعلیٰ ترین قوم سمجھتا تھا جس کا اظہار اس نے اپنی کتاب میں مکمل کر کیا۔ڈارون اور Herich von Treit Schke جو نسلوں کی تاریخ کا ماہر تھا کہ نظریات نے ہٹلر کے عزائم کو اور مضبوط بنایا۔اس کا کہنا تھا کہ قومیں ہمیشہ جدوجہد سے ہی زندہ رہ سکتی ہیں۔ہٹلر دوسرے یورپی لوگوں کو جرمنوں کے مقابلے میں معتبر سمجھتا تھا Emst Hackle جو ایک جرمن بائیولوجسٹ تھا نے یہ نظریہ پیش کیا کہ جسمانی اور ذہنی طور پر بیمار لوگ کسی بھی قوم کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتے ہیں۔اس نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ ایسے بچوں کو پیدائش کے فوراً بعد ہی قتل کر دینا چاہیے۔یہ شخص 1919ء میں مر گیا مگر اس کا نظریہ زندہ رہا اور اس پر ہٹلر نے عمل بھی کیا ہٹلر کا منصوبہ تھا کہ جرمن کو ایک عظیم سلطنت بنائیں گے جو ہزاروں سال تک قائم رہے گی۔مگر معذور لوگ اس خواب کی تعبیر میں بڑی رکاوٹ سمجھے جاتے تھے۔ہٹلر نے اقتدار میں آتے ہی ایسے لوگوں کے لیے خاص پالیسیاں ترتیب دیں اس نے ان لوگوں کے لیے ایسے سنٹر بنائے جہاں ان کی دیکھ بھال کا انتظام کیا گیا۔جب ان لوگوں کی بڑی تعداد یہاں آگئی تو ہٹلر کے حکم پر یہ لوگ خفیہ طور پر قتل کیے جانے لگے۔ہٹلر نے ایسے جوان لڑکے اور لڑکیوں کی آپس میں شادی کرائی جن کے بال سنہری اور آنکھیں براؤن تھیں۔کیونکہ ایسے ہی لوگوں کو اصل جرمن باشندے تصور کیا جاتا تھا۔ان کے علیحدہ سے ہاؤسز بنائے گئے جہاں وہ رہتے تھے۔ہٹلر کا نظریہ تھا کہ ان کے بچے بڑے ہو کر جرمن فوج کا حصہ بنیں گے یہ ہاؤسز 1935ء میں قائم کیے گئے۔نازی اعلیٰ آفیسر یہاں باقاعدگی سے دورہ کرتے تھے۔

جرمنوں کو ہٹلر نے متاثر کیا' ان کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں اپنی زندگی ہی میں ان مقاصد کی

طرف لے گیا۔ جنہیں وہ آخری حل قرار دیتا تھا۔ یہ آخری حل کیا تھا؟ کہ ایسی تمام اقوام کو ختم کر دیا جائے جنہیں گھٹیا خیال کرتا تھا ایسی اقوام میں یہودی' خانہ بدوش لوگ' کالے لوگ' ہم جنس پرست' ذہنی طور پر پسماندہ اور معذور لوگ شامل تھے وہ ہر لحاظ سے خالص بن کر جرمن نسل کی تشکیل کے لیے کوشاں تھا اس نے اس نظریہ کی خاطر لاکھوں لوگوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ یہی نظریہ جنگ عظیم دوم کا باعث بھی بنا کیونکہ ہٹلر علاقوں کو زیر کرنا چاہتا تھا اس کا کہنا تا کہ ''دنیا کی سب سے بڑی سچائی طاقت اور کامیابی ہے۔''

اسی دوران ایک اور لیڈر دنیا کے سامنے جلوہ گر ہوا اور وہ تھا اٹلی کو مسولینی' وہ ہٹلر کا اتحادی تھا، پہلے پہل وہ اخبار کے ایڈیٹوریل میں تھا اس نے اپنی جوانی میں ڈارون کی حمایت میں مضامین لکھے اور اسے سب سے بڑا سائنسدان قرار دیا۔ اقتدار سنبھالنے کے بعد اس نے ایتھوپیا پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اسے ڈارون کے نظریے کی رو سے جائز قرار دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اٹلی کے گورے لوگوں کو ایتھوپیا کے کالے لوگوں پر حکمرانی کا پورا حق ہے۔ آہستہ آہستہ اس نے فاشزم کے فلسفہ کو اپنا لیا۔ فاشزم کا فلسفہ شدید قسم کی قوم پرستی کا حامل ہے اور قومی وحدت کے نام پر شخصی آزادیوں کے خلاف ہے' گویا فاشزم قومی تعصب کے اصولوں کا حامی ہے۔ کمیونزم کی طرح فاشزم پر قومی تعمیر اور پیداوار کے ادارے کو ریاست کی ملکیت میں لینے اور تمام معیشت میں مساوات قائم کرنے کا دعویٰ نہیں کرتا۔

مسولینی نے 9 مئی 1935ء کو ایتھوپیا پر حملہ کرنے کے بعد چار لاکھ نفوس کے ایک مجمع میں اعلان کیا کہ اٹلی نے رینا میں اطالوی سلطنت کے قیام کی بنیاد رکھ دی ہے، اس کے اس نظریئے نے اٹلی کو دوسری جنگ عظیم کو لپیٹ میں دے دیا۔ اس کے نظریہ کی وجہ سے لاکھوں لوگوں کو قتل کر دیا گیا۔ بالآخر 28 اپریل 1945ء کو مسولینی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا اور دوسرے فاشسٹوں کی لاشوں کے ساتھ میلان شہر کے ریلوے اسٹیشن پر نمائش کے لیے لٹکا دیا گیا۔

اٹھارہویں صدی میں دو ایسے فلاسفر آئے جن کے نظریات کے انیسویں صدی میں قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا یہ دو جرمن فلاسفر کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز تھے۔ سائنسی اشتراکیت پسندی کا اصل بانی کارل مارکس تھا۔ وہ 1818ء میں جرمنی میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک قانون دان تھا سترہ برس کی عمر میں وہ بون یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم کے حصول کے لیے داخل ہوا۔ بعد ازاں برلن یونیورسٹی منتقل ہو گیا۔ جینا یونیورسٹی سے اس نے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی

سند حاصل کی۔ مارکس کی تحریروں نے اشتمالیت پسندی اور اشتراکیت پسندی کی متعدد جدید شاخوں کے لیے نظریاتی اساس مہیا کی۔ مارکس کی وفات کے وقت کسی ملک میں ان خیالات کا عملاً اطلاق نہیں ہوا تھا۔ بعد ازاں روس اور چین سمیت متعدد ممالک میں اشتراکی حکومتیں قائم ہوئیں جب کہ متعدد ممالک میں اس کی تعینات پر مبنی تحاریک نے سر اٹھایا اور اقتدار پر قابض ہونے کی کاوشیں ہوئیں ان کی مارکسی انجمنوں کی سرگرمیوں میں دہشت گردی کے اور بغاوت بپا کرنا ہے۔ حکومت حاصل کرنے کے بعد بھی انہوں نے جنگیں وحشیانہ' جبر وتشدد اور اخراج سے بھی گریز نہ کیا۔ ان خونی سرگرمیوں نے دنیا کو سالہا سال تک بدامنی کی حالت میں اس قدر تباہی کسی اور فلسفی کی تحریروں کی وجہ سے نہ ہوئی جس طرح مارکسزم کی وجہ سے ہوئی مارکسی تحاریک بالعموم چار بنیادی نکات پر اصرار کرتی ہیں۔

1- چند امیر لوگ بہت زیادہ دولت کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں جب کہ دوسری بیشتر محنت کش نسبتاً مفلسی کی حالت میں رہتے ہیں۔

2- اس ناانصافی کا تدارک یہ ہے کہ اشتراکی نظام قائم کیا جائے۔ یہ ایسا نظام ہے جہاں پیداوار کے ذرائع نجی شعبے کی بجائے حکومت کی تحویل میں ہوتے ہیں۔

3- بیشتر مثالوں میں اس نظام کی استواری کا واحد عملی وسیلہ ایک پرتشدد انقلاب ہے۔

4- اس اشتراکی نظام کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک خاص وقت کے لیے اشتمالی تنظیم کی آمریت قائم کی جائے۔

انیسویں صدی میں لینن اس نظریہ کا بڑا لیڈر تھا، اس نے اس نظریہ کی خاطر جیلیں کاٹیں اور جلاوطنی کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ اس کی کامیابی میں بنیادی کردار جنگ عظیم اول نے ادا کیا جس کی وجہ سے سوویت یونین داخلی طور پر کافی کمزور ہوگئی اور لوگ حکومت کے مخالف ہو گئے۔ اکتوبر 1917ء میں کمیونسٹوں نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ایک طویل خانہ جنگی شروع ہوگئی جو کمیونسٹوں اور حکومتی حمائتیوں ......شاہی خاندان کے افراد کے قتل کر دیا گیا۔ اس طرح کمیونزم کے نظریات کی حامل پہلی حکومت قائم ہوئی۔ ملک کے تمام وسائل کو حکومتی تحویل میں لے لیا گیا اور ان کی نگرانی سپاہیوں کے ذمہ تھی۔

لینن کے انتقال کے بعد دنیا کا ظالم ترین ڈکٹیٹر اقتدار میں آیا اور وہ تھا سٹالن' اس کا نعرہ تھا کہ

''امراء کو ختم کرو''، اس کی پالیسیوں کی وجہ سے اڑھائی کروڑ روسیوں کو موت کی نیند سلا دیا گیا۔ اس کی پالیسیوں کی بدولت قحط اور بھوک پیدا ہوئی۔ روسی معاشرے میں خانہ جنگی اور کمیونزم کے نظریہ کے قیام کے لیے بھی لاکھوں لوگوں کو ہمیشہ کے لیے موت کے شکنجے میں دے دیا گیا۔

سپاہیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ مشین گنوں سے ایسے کسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیں جو سٹالن کے حکم سے انحراف کے طور پر اپنی جائیدادیں فصلیں اور مال مویشی سے دستبردار ہونے کو تیار تھے بعض اوقات پورے کے پورے گاؤں لاشوں سے بھر گئے۔ سٹالن کے اپنے بیان کے مطابق 1933ء میں ایک کروڑ اسی لاکھ ملکی گھوڑے، ڈیڑھ کروڑ مویشی ذبح کر دیئے گئے اور کسانوں نے لاکھوں ایکڑ میں کھڑی فصلوں کو آگ لگا دی تاہم یہ احتجاج بھی اس کے نظریے میں تبدیلی نہ لا سکا۔ نتیجے کے طور پر احتجاج کرنے والے کسانوں کو گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا گیا۔ ان کو ایسے کیمپوں میں جبری مشقت کے لیے بھیجا گیا جہاں وہ کام کرتے ہوئے مر گئے یا پھر ان کو گولیوں سے بھون دیا گیا۔ اپنے طویل دور حکومت میں تسلیم شدہ تاریخی حقائق کے مطابق تقریباً دس لاکھ نفوس کو سٹالن اور ریاست کا دشمن قرار دے کر قتل کر دیا گیا۔ اسی لاکھ افراد سٹالن کی پالیسیوں سے جنم لینے والے قحط کی نذر ہو گئے اور تقریباً اسی لاکھ افراد جبری مشقت کے آرکٹک اور سائبیریا میں قائم کئے گئے کیمپوں میں ہلاک ہو گئے اور تقریباً اتنی ہی تعداد میں روسی افراد کو روس کی آبادی کے سرکاری ریکارڈ کے مطابق گم Missing قرار دیا گیا۔ ایک شخص کے نظریے کے فروغ کے لیے اڑھائی کروڑ افراد کو ہلاک کر دیا گیا۔ سٹالن کے ساتھ دوسرے لوگ بھی اس کے نظریہ کے حامی تھے اور وہ اس کا پورا ساتھ دیتے تھے ویسے بھی خونی رشتوں سے زیادہ نظریاتی رشتے مضبوط ہوتے ہیں۔

روس میں کمیونسٹ حکومت کے قیام کے بعد اس کے اثرات دوسرے علاقوں تک پھیل گئے چین میں کمیونسٹ ماؤزے تنگ کی قیادت میں زور پکڑ رہے تھے۔ ان کی مدد سٹالن نے بھی کی۔ اس نظام کو رائج کرنے کے لیے تیس ملین لوگ مارے گئے۔

بیسویں صدی میں ایک اور کمیونسٹ جماعت نے کمبوڈیا میں سر اٹھایا۔ پول پاٹ کمبوڈیا کا سیاسی رہنما تھا۔ اس کی ''قمر روج'' نامی گوریلا کمیونسٹ تحریک نے 1975ء میں کمبوڈیا کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اس کے دور میں مخالفین کو تشدد کے بعد موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ جب کہ 1975ء سے 1979ء تک کمبوڈین قحط نے 70 لاکھ افراد کو لقمہ اجل بنایا۔ پول پاٹ نے عجلت میں اپنے ملک کو اپنے تصورات کے

مطابق مثالی زرعی ریاست بنانے کے لیے شہروں کو خالی کرانا شروع کر دیا۔ اسی مقصد کے لیے اس نے سرمایہ، ذاتی جائیداد اور مذہب کو شجر ممنوعہ قرار دیا اور کمیوں کی شکل میں اجتماعی دیہاتی زندگی کو فروغ دینا چاہا۔

پول پاٹ نے خود تسلیم کیا کہ اس نے کمیونسٹ معاشرہ کو پیدا کرنے کے لیے اپنے ملک کو "صفر سال" سے شروع کیا۔ اس نے کمبوڈیا میں بدھ مراکز تباہ کر دیئے، اس نے تمام سکول اور کاروباری مرکز بند کر دیئے اور جدید شہروں کے باشندوں سے کہا کہ وہ دور دراز علاقوں میں چاول کاشت کرنے والے زمیندار بن جائیں۔ اس کا خیال تھا کہ جب ملک کا ہر شہری خوراک پیدا کرنے لگے گا تو ملک کو کسی بیرونی امداد کی ضرورت نہ رہے گی۔ اس کی اس حکمت عملی کا المیہ یہ تھا کہ کمبوڈیا کی ساری معیشت بر آمدات اور غیر ملکی ڈالروں کی محتاج تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ماؤ کے اس طوطے نے جلد ہی ملک کا قانونی ڈھانچہ اور نظام عدل بگاڑ کر رکھ دیا اور کمبوڈیا کی معیشت تہس نہس ہو گئی۔

ان نظریات کی وجہ سے جتنی تباہی اور قتل و غارت پچھلے ڈیڑھ سو سال میں ہوئی اس کی مثال پوری تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ جتنے لوگ ان نظریات کی وجہ سے قتل ہونے والے لوگوں سے زیادہ ہے۔ ان نظریات نے کروڑوں لوگوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیا جن میں بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی جو ان سے واقف بھی نہ تھے۔

خالصتان تحریک' ماضی اور حال

بھارت جسے دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک اور سیکولر ریاست کا نام دیا جاتا ہے اس کے لیڈر بڑی ڈھٹائی سے جمہوریت پسند اور سیکولر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہندو اپنی مکاری اور ہوشیاری سے دنیا کو یہ باور کروانے کی کوشش کرتے ہیں کہ بھارت میں اقلیتوں کو برابری کی سطح پر حقوق دیئے جاتے ہیں جبکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ ہر سال ہزاروں لوگوں کو متعصب ہندو اپنی دہشت گردی کا نشانہ بناتے ہیں۔ کسی بھی دوسرے مذہب کے لوگوں کی جان و مال محفوظ نہیں ۔ جب کسی ملک میں ایسے حالات ہوں جہاں لوگ اپنے مستقبل کے لیے تذبذب کا شکار ہوں تو وہاں اقلیتوں کو آزادی کے لیے آواز بلند کرنا ہی پڑتی ہے۔

ایسی ہی ایک تحریک مشرقی پنجاب میں آزاد خود مختار سکھ ریاست ''خالصتان'' کے قیام کے لیے انتہا پسند سکھوں نے شروع کی۔ یہ تحریک گزشتہ برسوں کے دوران بھارت میں رونما ہونے والے واقعات کا نتیجہ تھی ۔ اس تحریک نے ماضی کے گہرے دوستوں ہندو اور سکھوں کو ایک دوسرے کا جانی دشمن بنا دیا۔ 1947ء سے پہلے سکھوں کے ہاتھوں سے مسلمانوں کا قتل عام کروانے والے اور پاک بھارت جنگوں میں پاکستان کے خلاف سکھوں کو لڑانے والے متعصب اور چال باز ہندو آج خود سکھوں کی جان کے دشمن بن گئے تھے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ صدیوں سے اکٹھے رہنے والے ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان دشمنی کیوں پیدا ہوئی؟ 1947ء میں سیاسی طور پر بھارت میں ضم ہونے والی اور علیحدہ سکھ ریاست کے قیام سے انکار کرنے والی قوم اب بھارت سے علیحدگی اور خود مختار ریاست ''خالصتان'' کے قیام کے لیے جدوجہد کیوں کر رہی تھی؟ تقسیم ہند کے بعد سکھ لیڈروں کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب

ہندوؤں نے ان کی مذہبی اور تاریخی پہچان کو نقصان پہنچانے کے لیے عملی کوششوں کا آغاز کر دیا۔ اور 26 جنوری 1950ء کو نافذ ہونے والے آئین کی شق نمبر 25 میں سکھ مذہب کو ہندو مذہب کی شاخ قرار دیا گیا۔ جس کے تحت سکھوں کی منفرد سیاسی، مذہبی اور معاشرتی شناخت کو ختم کر دیا گیا اور سکھوں کو ہندو قومیت کا ایک جزو قرار دے دیا گیا۔

اس طرح پنجابی کی بجائے ہندی کو پنجاب کی زبان قرار دیا گیا جس کا دوسرا مقصد سکھوں کی لسانی حیثیت کو ختم کرنا تھا۔ جہاں سے علیحدہ پنجابی صوبے کے قیام کی تحریک نے جنم لیا اور ہندی کی بجائے پنجابی زبان کو نافذ کرنیکا مطالبہ کیا گیا جب بھارت میں لسانی بنیادوں پر صوبوں میں تقسیم اور ان میں تغیر و تبدل کا عمل شروع ہوا تو سکھ لیڈروں نے 1955ء میں ''سٹیٹ ری اورگنائزیشن کمیشن'' کے سامنے اپنا مطالبہ کیا مگر کمیشن نے صوبے کے مطالبے کو مسترد کر دیا جبکہ برسوں سے سکھوں کے ساتھ پنجاب میں رہنے والے ہندوؤں نے کھلم کھلا پنجابی زبان کے نفاذ اور پنجابی صوبے کے خلاف مہم شروع کر دی۔ یہ ہندو اور سکھ کے سیاسی اختلافات کا نقطہ عروج تھا۔ 1961ء میں سکھ رہنما ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب کی تقسیم کے لیے 47 روز تک بھوک ہڑتال کی۔ اسی طرح دو مذہبی رہنماؤں نے بھی پنجاب کو متحد رکھنے کے لیے بھوک ہڑتال کی۔ اس وقت کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے پنجاب کی تقسیم نہ کی۔ اس دوران سکھ سیاسی جماعت اکالی دل کی طرف سے سیاسی احتجاج اور ہنگامہ آرائی جاری رہی۔ بہادر لال شاستری کی وفات کے بعد جب مسز اندرا گاندھی بھارت کی وزیر اعظم بنی تو انہوں نے اکالی دل کے دباؤ کے تحت مشرقی پنجاب کو 1966ء میں ہریانہ اور پنجاب میں تقسیم کر دیا۔ ہریانہ پنجاب میں رہنے والے ہندوؤں کو دیدیا گیا اور مشرقی پنجاب کا باقی حصہ پنجاب کہلایا۔ اس طرح 19 برس بعد پنجاب پھر تقسیم ہو گیا لیکن اس تقسیم کا سب سے قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ چندی گڑھ پنجاب اور ہریانہ کا مشترکہ دارالحکومت بنا دیا گیا۔ 1969ء میں اکالی دل جماعت جب گرنام سنگھ کی قیادت میں صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں واحد اکثریتی جماعت کے طور پر ابھری تو اس نے چندی گڑھ کو پنجاب میں شامل کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ ماسٹر تارا سنگھ اور سنت فتح سنگھ نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو ختم کرنے کی دھمکی دی لیکن انہوں نے اپنے عہد کو توڑتے ہوئے اس دھمکی کو موت تک روزہ رکھنے میں تبدیل کر دیا۔ ایک اور سکھ لیڈر سردار روشن سنگھ نے 15 اگست 1969ء کو اس مطالبے کو مرکزی حکومت سے تسلیم کروانے کے لیے تا مرگ بھوک ہڑتال کرنے کا اعلان کر دیا اور اپنا وعدہ نبھاتے ہوئے 74 دن بعد بھوکا رہنے کے

بعد وفات پا گئے۔ جس پر سکھوں نے سنت فتح سنگھ کو شرمندہ کیا تو انہوں نے 26 جنوری 1970ء کو عہد کیا کہ چندی گڑھ پنجاب کو نہ دیا گیا تو وہ اپنی زندگی ختم کر دیں گے۔ اس اعلان پر وزیر اعظم اندرا گاندھی خوف زدہ ہو گئیں مگر 1975ء میں چندی گڑھ پنجاب کے حوالے نہ کیا گیا۔

جنوری 1980ء کے انتخابات جیتنے کے بعد اندرا گاندھی نے ملک کی تمام اپوزیشن سیاسی پارٹیوں سمیت اکالی دل کے ساتھ غیر مفاہمانہ رویہ اختیار کر لیا۔ انہوں نے اپنے سیاسی مخالفین سے نمٹنے کے لیے طاقت کا استعمال شروع کر دیا۔ اندرا گاندھی نے اکالی دل کی قوت اور اتحاد کو توڑنے کے لیے 37 سکھ مذہبی رہنما سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ کو سیاسی طور پر ابھارا۔ انہوں نے شروع سے ہی سیاسی حقوق کے حصول کے لیے طاقت اور تشدد کے استعمال پر زور دیا۔ اس طرح سکھ عوام آہستہ آہستہ اکالی دل لیڈروں کو چھوڑ کر بھنڈرانوالہ کے گرد جمع ہونے لگے۔ کیونکہ وہ اکالی دل لیڈروں کی پرامن سیاست سے اکتا چکے تھے۔ اس طرح مسز اندرا گاندھی کی توقعات کے برعکس بھنڈرانوالہ 1081ء سے 1983ء کے مختصر عرصہ میں ایک غیر متنازعہ لیڈر بن گیا۔ مسز اندرا گاندھی کی آنکھیں تب کھلی جب بھنڈرانوالہ نے سکھوں کے حقوق کے لیے مرکزی حکومت کے خلاف تشدد کی سیاست اختیار کرنے کا اعلان کر دیا اور دربار صاحب امرت سر میں اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کر کے انتہا پسند سکھ پیروکاروں کو اپنے گرد جمع کر لیا۔ اس طرح پنجاب میں دہشت گردی، تشدد اور انتہا پسند سیاست کا آغاز ہوا۔ آل انڈیا سکھ سٹوڈنٹس فیڈریشن بھی مرکزی حکومت کے خلاف اس تحریک میں شامل ہو گئی اور آزاد ''خالصتان'' کے نعرے لگائے جانے لگے۔ جب بھنڈرانوالہ اور اس کے پیروکاروں کی سرگرمیاں پنجاب میں بہت زیادہ بڑھ گئیں اور صوبائی حکومت اسے روکنے میں ناکام ہو گئی تو مسز اندرا گاندھی نے اکتوبر 1983ءمیں وزیر اعلیٰ سردار دربار سنگھ کی حکومت کو برطرف کر کے گورنر راج نافذ کر دیا۔ اس طرح سکھوں کی انتہا پسندی میں اور اضافہ ہو گیا۔ مارچ 1984ء میں آل انڈیا سکھ سٹوڈنٹس فیڈریشن پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس ماہ ایک قانونی شق کے تحت فوج کو سول انتظامیہ کی امداد کی اجازت دیدی گئی۔ 1984ء میں ایک نئے قانون کے تحت سکھ انتہا پسندوں کو بغیر عدالتی کارروائی کے دو سال تک قید میں رکھنے کا صوبائی انتظامیہ کو اختیار دیدیا گیا۔ ان تمام اقدامات کا مقصد بھنڈرانوالہ کو اور اس کے پیروکار سکھ انتہا پسندوں کی

سرگرمیوں پر قابو پاتا تھا۔

بھنڈرانوالہ نے حکومت کے ساتھ مذاکرات کو بے سود قرار دیتے ہوئے اپنے حقوق کی شناخت کے تحفظ کے لیے طاقت کے استعمال پر زور دیا اور عملی طور پر پنجاب میں صدر راج کو ہی ناکام بنا کر رکھ دیا۔ جس سے مسز اندرا گاندھی کے لیے پنجاب میں تشویش ناک صورت حال پیدا ہوگئی جس سے نمٹنے کے لیے بھارتی وزیراعظم نے فوج کو دربار صاحب میں مقیم بھنڈرانوالہ اور اس کے ساتھیوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ برصغیر کی تاریخ میں پہلا موقعہ تھا کہ سکھوں کی مقدس عبادت گاہ کی کھلم کھلا بے حرمتی کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ چنانچہ 3 جون 1984ء کو بھارتی فوج نے دربار صاحب کی عمارت کو گھیرے میں لے لیا۔ 4 جون کو پورے مشرقی پنجاب میں کرفیو لگا دیا گیا۔ گاڑیوں اور بسوں کی آمدورفت پر پابندی لگا دی گئی اور اخبارات پر سنسر عائد کر دیا گیا اور پاکستان سے ملنے والی سرحدوں کو بند کر دیا گیا۔ 5 جون کو مشرقی پنجاب سے تمام غیرملکی اور ملکی اخبار نویسوں کو نکال دیا گیا اور 6 جون 1984ء کو بھارتی فوج نے گوردوارہ دربار صاحب پر چاروں اطراف سے بھرپور حملہ کر دیا اور اس حملہ کو ''بلیو سٹار آپریشن'' کا نام دیا گیا۔ سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ اور اس کے ساتھیوں نے بڑی جرأت اور بہادری کے ساتھ بھارتی فوج کا مقابلہ کیا۔ فوج نے اکالی دل کو تباہ کر دیا۔ تقریباً 5 ہزار مرد اور عورتیں فوج اور بھنڈرانوالہ کے آدمیوں میں کراس فائر کی زد میں آ کر ہلاک ہوگئے۔ ان میں اکثریت بے گناہ زائرین کی تھی۔ جو اس ٹیمپل کے بانی گورو داوجن دیو کا یوم شہادت منانے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ اسی تصادم میں بھنڈرانوالہ اور اس کے ساتھی بھی قتل ہوگئے۔ چند ماہ بعد 31 اکتوبر کو اندرا گاندھی اپنے دو سکھ باڈی گارڈوں کے ہاتھوں ماری گئی۔ اس کا نتیجہ بہت ہولناک اور دہشت انگیز نکلا۔

شہروں اور قصبوں میں کانگرسی رہنماؤں کی زیر قیادت مشتعل لوگوں نے سکھوں کا زبردست جانی و مالی نقصان کیا۔ صرف دہلی میں 3 ہزار سے زیادہ سکھوں کو زندہ جلا دیا گیا اور 70 سے زیادہ گوردواروں کو مسمار کر دیا گیا۔ ہندو دہشت گردوں نے یکم نومبر کو 2000 سے زائد سکھوں کا قتل عام کیا اور اسی روز بھارتی فوج میں ہندو فوجیوں نے تقریباً 2000 فوجیوں کو ہلاک کر دیا۔ اس کے علاوہ 2000 سے زیادہ سکھ فوجی ہندو افسروں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر فرار ہوگئے۔ اس واقعہ کے بعد دونوں کے مابین انتقام کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ دونوں انتہا پسند گروپ ایک دوسرے پر

بڑے پیمانے پر حملے کرنے لگے۔ اس سے مشرقی پنجاب کی سیاسی صورت حال بڑی غیر یقینی ہو گئی۔ مسز اندرا گاندھی کے قتل کے بعد ان کے بیٹے راجیو گاندھی کو بھارت کا چھٹا وزیر اعظم نامزد کیا گیا۔ جنہوں نے فوراً ملک میں پارلیمنٹ کے عام انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا۔ یہ انتخابات دسمبر 1984ء میں منعقد ہوئے جس میں کانگرس نے عوام سے بھارت کے جغرافیائی اتحاد اور قومی یکجہتی کے نام پر ووٹ مانگے اور حسب توقع ان کو غیر معمولی اکثریت سے کامیابی ہوئی۔ راجیو گاندھی نے جلدی انتخابات کرانے کا اعلان کیا تھا کیونکہ ہندو عوام کی ہمدردیاں کانگرس کے حق میں تھیں۔ راجیو گاندھی وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ انہوں نے سکھوں کی جماعت اکالی دل کے رہنماؤں کو مذاکرات کی باقاعدہ دعوت دی۔ بالآخر اکالی دل کے صدر سنت لنگوال کی قیادت میں مرکزی حکومت کے ساتھ مذاکرات شروع ہوئے۔ ان مذاکرات کے نتیجے میں بالآخر مرکزی حکومت اور اکالی دل کے درمیان 24 جولائی 1985ء کو معاہدہ ہوا جسے ''راجیو لنگوال معاہدہ'' کا نام دیا گیا۔ اس معاہدے میں راجیو گاندھی نے پنجاب اور ہریانہ کے مشترکہ دار الحکومت پر سکھوں کا حق تسلیم کر لیا۔ انہوں نے 26 جنوری 1986ء تک اسے پنجاب کے حوالے کرنے کا وعدہ کیا۔

ہریانہ کے ریاستی لیڈروں نے اس کی بھرپور مخالفت کی اور اسمبلی کے اراکین نے دہلی میں مظاہرہ کیا اور اسمبلی کی رکنیت سے مستعفی ہونے کی دھمکی دی۔ ہریانہ کے وزیر اعلیٰ نے بھی راجیو گاندھی کو خبردار کیا کہ اس معاہدے پر عمل ہوا یا اسے منسوخ نہ کیا گیا تو آئندہ انتخابات میں کانگرس آئی کی شکست یقینی ہو گی۔ اسی طرح دوسرے کانگرسی لیڈروں نے الزام لگایا کہ اس سارے مسئلے پر ہم سے مشورہ نہیں کیا گیا۔ سارے ملک میں متعصب ہندوؤں نے اس کے خلاف مظاہرے شروع کر دیئے۔ آخر طے پایا کہ پنجاب میں ریاستی اسمبلی کے انتخابات کروائے جائیں گے اور صدر راج ختم کر دیا جائے گا۔ دوسری طرف انتہا پسند سکھوں نے اس معاہدہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے لنگوال کو غدار قرار دیا۔ حتیٰ انہوں نے راجیو گاندھی اور لنگوال کو قتل کرنے کی دھمکی دی۔ ستمبر 1985ء میں انتخابات کا اعلان ہوا۔ اکالی دل کے رہنماؤں نے اس معاہدے کو سکھوں کی سیاسی فتح قرار دیا۔ انہوں نے سکھ قومیت کے نام پر ووٹ مانگے۔ اسی دوران جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ کے والد جوگندر سنگھ اور انتہا پسند ساتھیوں نے اکالی دل سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اسی طرح آل انڈیا سکھ سٹوڈنٹس فیڈریشن بھی اکالی دل سے علیحدہ ہو گئی۔ انتہا پسند گروپوں نے انتخابات کو رکوانے کے لیے دہشت گردی کی سرگرمیوں کو تیز کر دیا اور 20 اگست

1985ء کو انہوں نے اکالی دل رہنما سنت لنگوال کو قتل کر دیا۔ اس قتل نے بھارتی لیڈروں اور عوام کو حیران کر کے رکھ دیا۔ مسز اندرا گاندھی کے بعد لنگوال کا قتل دوسرا بڑا واقعہ تھا۔ دوسری طرف راجیو گاندھی انتخابات کروانے پر ڈٹے رہے۔

انتخابات کے نتائج حیران کن تھے۔ اکالی دل اکثریتی جماعت کے طور پر ابھری۔ 60 فیصد سکھ آبادی نے ایک ووٹ بھی کسی ہندو امیدوار کو نہ دیا۔ اکالی دل نے صوبائی اسمبلی کی 73 اور لوک سبھا کی 7 نشستیں حاصل کیں۔ اس طرح پنجاب سے گزشتہ دو سال سے جاری گورنر راج ختم ہو گیا۔ سرجیت سنگھ کی قیادت میں اکالی دل نے حکومت قائم کی۔ اکالی دل کی جیت میں ہندوؤں کی انتہا پسندانہ پالیسیوں نے بنیادی کردار ادا کیا۔ پوری سکھ قوم ہندوؤں کے ظالمانہ اور امتیازی سلوک سے آگاہ ہو چکی تھی اور ان میں سیاسی شعور بھی بیدار ہو چکا تھا۔ گوردوارہ امام صاحب امرتسر پر فوج کے حملے کے بعد کوئی سکھ بھی ہندوؤں کو اپنا دوست تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ بلکہ اس واقعہ نے دونوں قوموں کے درمیان نفرت کا وہ بیج بو دیا جس کا اثر آئندہ صدیوں تک رہے گا۔ مختصر یہ کہ 26 جنوری 1986ء کو چندی گڑھ پنجاب کے حوالے نہ کیا گیا جس پر سرجیت سنگھ برنالہ حکومت نے شدید احتجاج کیا اور لاتعداد متعدل اکالی رہنما اور کارکن انتہا پسند سکھوں کے ساتھ مل گئے۔ اس طرح بھنڈرانوالہ کا نظریہ سچ ثابت ہو گیا کہ متعصب ہندوؤں سے پرامن بات چیت کے ذریعے حقوق یا آزادی حاصل کرنا خام خیالی ہے۔ اس کا واحد راستہ طاقت کا استعمال اور مسلح جدوجہد کے ذریعے آزاد "خالصتان" کا قیام ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ 20 ہزار سکھ انتہا پسندوں نے 26 جنوری 1986ء کو گولڈن ٹیمپل امرتسر پر زبردستی قبضہ کر لیا اور حکومت کے حمایتی سکھوں کو باہر نکال دیا۔ اس عمارت کے چاروں اطراف خالصتان کے جھنڈے لہرانے لگے۔

ستمبر 1985ء میں ہونے والے صوبائی انتخابات کے نتیجے میں برسر اقتدار آنے والی سردار سرجیت سنگھ برنالہ کی حکومت کو مئی 1987ء میں برطرف کر کے پنجاب میں گورنر راج نافذ کر دیا گیا۔ سرجیت سنگھ کی حکومت پر انتہا پسند سکھوں کی حمایت کا الزام لگایا گیا۔ تمام سکھ رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ سدھارا تھا شنکر رلی کو پنجاب کا گورنر بنا دیا گیا۔ جنہوں نے انتہا پسند سکھوں کو سختی سے کچلنے کی پالیسی اختیار کی۔ انہوں نے سکھوں کیخلاف زبردست اور وسیع پیمانے پر کارروائی شروع کی جس کے نتیجے میں مارچ 1988ء سے لے کر جون تک صرف تین ماہ میں سترہ سو سکھوں کو مختلف الزامات کے تحت گرفتار کیا گیا۔ جب کہ 400 سے زائد انتہا پسند سکھ پولیس مقابلوں

میں ہلاک ہوئے۔ اس انتہا پسندانہ پالیسی کے جواب میں علیحدگی پسند سکھوں نے بھی اپنی تشدد آمیز سرگرمیاں تیز کر دیں۔ انہوں نے ہندوؤں کو قتل کرنے سے گریز نہ کیا۔ سکھوں نے اپنے آپ کو منظم مسلح گروپوں کی شکل میں متحد کر لیا' جن میں خالصتان کمانڈو فورس اور لبریشن فورس برائے خالصتان بہت مشہور تھی۔ انتہا پسند سکھوں کے پاس نہ صرف چین کے بنے ہوئے جدید ہتھیار تھے بلکہ روس کے بنے ہوئے راکٹ لانچر اور میزائل بھی تھے۔ وہ جدید گوریلا جنگی تکنیک سے بھی واقف تھے۔ انکی مالی اور اخلاقی مدد دوسرے ممالک میں مقیم سکھوں نے کی۔ اسی وجہ سے خالصتان کی تحریک زور پکڑ گئی جن کی کارروائیاں بہت کامیاب رہیں۔ جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف 1987ء میں انتہا پسندوں کے ہاتھوں 1238 افراد ہلاک ہوئے جبکہ صرف 328 سکھ انتہا پسند پولیس کے ہاتھوں مارے گئے۔ 1988ء میں 25 مئی تک 1150 افراد دہشت گردی کا شکار ہوئے جبکہ صرف سکھ انتہا پسند پولیس کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ انہوں نے اپنا ہیڈ کوارٹر امرتسر میں واقع گولڈن ٹیمپل کو بنایا۔ اس کے مختلف حصوں میں اسلحہ کے ذخائر جمع کیے اور مورچے بنائے۔ جب ان کی سرگرمی انتہا کو پہنچ گئی تو راجیو حکومت نے گولڈن ٹیمپل میں قیام پذیر انتہا پسند سکھوں کے خلاف دوبارہ کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ 18 مئی 1984ء کو بھارتی فوج نے گولڈن ٹیمپل کا محاصرہ کیا اور یہ محاصرہ دس روز تک جاری رہا۔ بھارتی فوج اور انتہا پسند سکھوں کے درمیان شدید لڑائی ہوئی۔ اس آپریشن کو ''بلیک تھنڈر آپریشن'' کا نام دیا گیا۔ اس آپریشن میں فوج اور پولیس انتہا پسند سکھوں پر مکمل طور پر غلبہ پانے میں ناکام رہی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انتہا پسند سکھ سارے پنجاب میں پھیل گئے اور تشدد آمیز کارروائیاں کرنے لگے۔ انہوں نے راہ چلتے ہندوؤں پر حملے شروع کر دیئے۔ اس طرح سکھوں کے ہاتھوں پورے پنجاب میں ہندوؤں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ آج بھی عالمی سطح پر خالصتان تحریک کے لیے سکھ نوجوانوں کی بڑی تعداد سرگرم ہے جو کینیڈا، برطانیہ اور امریکہ میں مقیم ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق صرف امریکہ میں انتہا پسند سکھوں کی 18 تنظیمیں ہیں۔ کونسل آف خالصتان کے صدر ڈاکٹر گمت سنگھ آ ڈلکھ ہیں جو خالصتان کی تحریک کو عالمی سطح پر اجاگر کرنے میں اور تمام سکھوں کو متحد رکھنے میں بنیادی کردار ادا کر رہے ہیں۔ انہوں نے گیارہ فروری 2004ء کو ایک خط تمام سکھ تنظیموں اور اداروں کو بھیجا جن کے

خاص پوائنٹس یہ ہیں:

1...... حال ہی میں فرانس کی حکومت نے سکھوں کے مذہبی لباس پر پابندی عائد کردی تھی جو کہ ہمارے مذہبی حقوق کے ساتھ زیادتی ہے۔ہم نے اس پر احتجاج کیا مگر ہمارا احتجاج اتنا موثر ثابت نہیں ہوسکا۔ کیونکہ ہم عالمی سطح پر اپنی شناخت بنانے میں ناکام رہے ہیں اور ہماری شناخت ایک آزاد وطن کے طور پر ہی ہوسکتی ہے۔ یہودی آج تعداد میں کم ہونے کے باد جود بھی اپنی بات عالمی سطح پر منوا سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس ایک آزاد ملک ہے جو کہ ہمارے پاس نہیں ہے۔

2...... آج ہندوستان میں ہر شعبے میں ہندوؤں کا قبضہ ہے۔ اگر آپ کو انڈیا میں رہنا ہے تو یا تو آپ ہندو ہوں یا پھر ان کے غلام ورنہ وہاں ذلت کے سوا کچھ نہیں۔

3...... پچھلے بیس سال میں اڑھائی لاکھ سکھوں کو بے رحمی سے قتل کر دیا اور باون ہزار کو سیاسی قیدی بنا لیا گیا۔ جن کے ٹرائل 1984ء سے عدالتوں میں چل رہے ہیں۔ ایسا ملک جو جمہوری اقدام پر فخر کرتا ہے وہاں یہ سارے اقدامات انتہائی شرمناک ہیں۔ دوسو سال پہلے امریکہ نے بیرونی تسلط کے خلاف جدوجہد کر کے آزادی حاصل کی تھی۔ آج ہم بھی پرامن طریقے سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر ہندو لیڈر بڑی مکاری سے ہم کو دہشت گرد ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

4...... ایک آزاد ملک میں لوگ آزادانہ طور پر اپنی فیملی کے ساتھ گھوم سکتے ہیں مگر بھارت میں یہ حق صرف ہندوؤں کو ہے، اقلیت کے لوگوں کے لیے کوئی آزادی نہیں۔ ان کی آزادی کو غلامی میں بدلنے کے لیے ہندو انتہا پسند تنظیم (RSS) کے غنڈے کام کر رہے ہیں۔ ان مسلح غنڈوں کی تعداد ۱۵ لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔

5...... اگر سکھ گولڈن ٹمپل پر ہندو حملے اور 20 ہزار سکھوں کے قتل پر احتجاج نہیں کریں گے تو وہ قوم کے طور پر اپنی حیثیت کھودیں گے۔

6...... دوسری اقلیتوں کے ساتھ بھی ظالمانہ سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ انڈین آرمی نے 1947ء سے لے کر آج تک ناگالینڈ کے 3 لاکھ عیسائیوں کو قتل کیا۔ عیسائی مشنریوں کو قتل کیا اور Nuns کے ساتھ زیادتیاں کیں۔ عیسائیوں کے سکول اور عبادت گاہوں کو تباہ کر دیا گیا۔ 2002ء میں گجرات میں مسلمانوں کی ہنستی کھیلتی بستیاں قبرستانوں میں بدل دی گئیں۔ یہ سارا کھیل حکومتی سرپرستی میں ہوا۔

7...... بھارت ایک ملک نہیں، اس میں بہت سے ملکوں کو اس کے قبضے میں دیا گیا ہے۔ جیسا کہ برطانوی راج کے دنوں میں تھا۔ اس ملک کی 18 سرکاری زبانیں ہیں۔ ملک کے کئی حصوں میں آزادی کی تحریکیں چل رہی ہیں۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے بہت سے ٹکڑے ہوں گے جس طرح ہنگیرین سلطنت اور سوویت یونین کے ہوئے جہاں بہت سی قوموں کے لوگ آباد تھے۔

سکھ تحریک کی کامیابی اور آزاد خالصتان ریاست کے قیام کے مستقبل قریب میں کوئی واضح آثار نہیں۔ کیونکہ ایک تو سکھ قوم دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ دوسرا یہ کہ اسے کسی بھی بڑی طاقت یا بھارت کے مخالف ملک کی عملی حمایت حاصل نہیں ہے۔ موجودہ دور میں آزادی کی تحریکوں میں بنیادی اور موثر کردار خارجی عوامل ادا کرتے ہیں۔ ان کے بغیر اس قسم کی تحریکیں آگے نہیں بڑھتیں۔ اگر 80 کی دہائی میں انڈیا کے دو حریف ممالک پاکستان اور چین سکھوں کی مدد کرتے، جیسے چین نے ویت نام کی مدد امریکہ کیخلاف اور پاکستان نے افغانستان کی سوویت یونین کے خلاف اور بھارت نے بنگلہ دیش میں پاکستان کے خلاف کی تھی تو آج نتیجہ کچھ اور ہوتا۔

مسلمانوں کا زوال اور تین تاتاری جنگجو

آج بھی ہزاروں سکالر خواہ وہ مشرقی ہوں یا مغربی، جب مسلمانوں کے مختصر سے عرصے میں لاکھوں میل علاقہ فتح کرنے کا پڑھتے ہیں تو وہ حیران ہو کر رہ جاتے ہیں۔ انہوں نے اس کی صرف ایک ہی وجہ بتائی اور وہ تھا ''ایمان کا جذبہ'' جس کے ذریعے وہ کافروں کے گروہوں کو چیرتے ہوئے کامیابی و کامرانی کی راہ پر گامزن ہوئے۔ اس کے بعد وہ کونسی ایسی آندھی آئی کہ وہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ آدھی دنیا پر کئی صدیوں تک حکومت کرنے والی اسلامی سلطنت چند سالوں میں غلام بن گئی۔ آج بھی مسلمان ہر جگہ ذلت وخواری میں مبتلا ہیں' کشمیر' بوسینا کوسووا' چیچنیا' عراق' افغانستان' ہندوستان' فلسطین غرض کے ہر گوشے میں مسلمانوں کا ہی خون بہایا جا رہا ہے۔ دنیا مسلمانوں کی تباہی میں مختلف عناصر شامل تھے مگر ان میں اہم ترین عدم اتفاق' فرقہ واریت اور حکمرانوں کی عیاشی اور عوام کے مسائل سے عدم دلچسپی تھے۔ مسلمان گزشتہ کئی صدیوں سے فلسفہ توحید کو مکمل طور پر ایمان کا جزو نہ بنانے کی وجہ سے دنیا بھر میں ذلت و رسوائی کی اندھیری گلیوں میں اندھے مسافر بنے ہوئے ہیں۔ آج مسلمانوں کی حالت قوم یہود کے دور زوال جیسی ہو چکی ہے۔ جس میں انصاف کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ جس جرم پر ایک غریب کو پھانسی کی سزا ہوتی ہے اسی جرم میں مبتلا امراء کے لیے گناہ شمار ہی نہیں ہوتا۔ احتساب ہی کسی قوم کو توانائی عطا کرتا ہے' جب کہ احتساب کا نظام ختم کر دینے والی قومیں تباہ ہو جایا کرتی ہیں۔ اگر مسلمانوں کی تباہی کے پس منظر پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کی بدقسمتی اور پسماندگی کے زیادہ تر اسباب داخلی تھے۔ اب ہم تاریخ میں ان واقعات کا ذکر کریں گے جن سے مسلمانوں کو بلندی سے پستی کی طرف دھکیل دیا گیا۔

مسلمانوں کو سب سے پہلا اور ناتلافی نقصان بنوامیہ اور بنوعباس کی دشمنی کہ وجہ سے ہوا۔ عباسی خلافت کا آغاز ہی ظلم اور اندھیر نگری سے ہوا تھا۔ انہوں نے لوگوں کو یہ تاثر دیا کہ ہم خاندان رسالت

کامیاب ہوگیا اور اپنے باپ کے دوست اور وہاں کے سردار سے جا ملا اور ایک طاقت ور انسان کے طور پر ابھرا۔ اس نے ایران پر 1219ء کو حملہ کر دیا۔ اس نے ایران کے بادشاہ خوارزم شاہ کی فوجوں کو تہس نہس کر دیا۔ اس کے علاوہ وہ دوسرے مسلمان علاقوں کو بھی قبرستان میں بدلنے میں کامیاب ہوگیا جس میں افغانستان اور شمالی ہند شامل ہیں۔ چنگیز خان نے منگولوں کی فوج کی دہشت اتنی پھیلائی تھی کہ حکمران سے لڑنے سے پہلے ہی ہمت ہار جاتے تھے۔ مسلمان آپس کی ناچاکیوں کی وجہ سے اتنے کم ہمت اور غیرت سے دور ہو چکے تھے کہ ایک تنہا تاتاری فوجی مسلمانوں کے بھرے گاؤں میں چلا جاتا اور لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح بے دریغ ذبح کرنے لگتا کوئی مزاحمت نہ کر سکتا۔

چنگیز خان کے منگول سردار کسی شہر پر حملہ کرتے تو وہ وہاں ناقابل یقین حد تک لوگوں پر ظلم وستم ڈھاتے اور تباہی مچاتے۔ وہ خوشی کی سرشاری سے بوڑھوں پر عذاب ڈھاتے' بچوں کو ذبح کرتے اور عورتوں سے زیادتی کرتے۔ اس بداخلاقی کے بعد وہ گھروں کو کھنڈر بنا دیتے اور ضروریات زندگی کی تمام اشیاء لوٹ لینے کے بعد پورے شہر کو آگ لگا دیتے۔ شعلوں کے نظاروں سے خوش ہوتے' دھواں اٹھتے دیکھ کر خوفناک قہقہے لگاتے۔ ایک مرتبہ خان کو اطلاع ملی کہ شہر کے کچھ لوگوں نے موت سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو مردہ لوگوں کے ڈھیروں میں چھپ کر اپنی جان بچانے کی کوشش کی ہے۔ خان نے نہ صرف ان جان بچانے والوں کے سر قلم کرا دیئے بلکہ اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ہر کنبے کے مرد افراد کو بھی سزا دے کر ان کی موت کو یقینی بنایا جائے۔

جب اخلاقی زبوں حالی کی یہ کیفیت ہو پھر وہی ہوتا تھا جو تیرھویں صدی عیسوی میں مغلوں (تاتاریوں) کے ہاتھوں مسلمانوں کا ہوا۔ پندرہویں صدی میں ہسپانیہ میں عیسائیوں کے سامنے مسلمان کا ہوا' اٹھارہویں صدی میں نادر شاہ کے ہاتھوں مغل حکمران (محمد شاہ) کا حشر ہوا اس سے پہلے تیمور نے مسلمانوں کی کھوپڑی کے مینار بنائے۔ اٹھارہویں صدی میں پنجاب میں سکھوں کے سامنے مسلمانوں کا حشر ہوا جب انہوں نے سید احمد شہید کی تحریک جہاد میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ 1971ء میں سقوط ڈھاکہ کی صورت میں پھر وہی سزا دی گئی لیکن شاید مسلمانوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔

دوسرا شخص جس نے مسلمانوں کو سنہری تاریخ کو ایسا داغ لگایا جو قیامت تک رہے گا۔ یہ شخص ہلاکو خان تھا۔ اس نے بغداد کا محاصرہ مکمل پچاس دن تک کیا۔ مرکز خلافت ہونے کے سبب بغداد اس وقت

دنیائے اسلام کا سب سے شاندار اور آباد شہر تھا۔ قلعہ بندیاں مضبوط تھیں، لیکن نہ دل اور نہ ایمان مستحکم تھا۔ محاصرے کے دوران تاتاری لشکر برابر ہوائی تیر، چھوٹے چھوٹے نیزے اور فلاختوں سے بھاری پتھر فصیل کے پار شہر کے اندر پھینکتا رہا۔ اس طرح سینکڑوں لوگ ہلاک و زخمی ہوئے۔ ایک طرف دجلہ دریا تھا اور دوسری طرف تاتاری لشکر کا دباؤ، مسلمان اس صورت حال میں بے بس تھے، اسی دوران خلیفہ کے وزیر اعلیٰ بن علقمی نے دہشت زدہ خلیفہ کو مشورہ دیا کہ تاتاریوں کا مقابلہ دشوار ہوگا، اس لیے خلیفہ اپنے فرزندوں کے ساتھ ہلاکو خان کے پاس جائیں اور اسے رشتے داری کی پیشکش کریں اور اس کے علاوہ سیم وزر کی جھلک دکھائیں تو لڑائی کے بغیر ہی سلطنت محفوظ ہو جائے گی۔

جب برا وقت آتا ہے تو عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے، جیسے ہی خلیفہ شہر سے باہر آیا، تاتاری اندر داخل ہو گئے۔ وہ دن اتوار کا تھا اور چھ سو چھپن ہجری صفر کی چار تاریخ تھی، جب سقوط بغداد ہوا۔ ہلاکو نے حکم دیا کہ شہر کے اندر باہر ہر چیز کو تاخت و تاراج کر دیا جائے۔ سب سے پہلے انہوں نے خندق کو مسلمان مقتولین کی لاشوں سے پاٹ کر سڑک کو زمین کے برابر کر ڈالا۔ قتل و غارت اس قدر زیادہ تھی کہ شہر کی بدروؤں سے گندے پانی کی جگہ خون بہنے لگا جو آگے دریائے دجلہ میں شامل ہو گیا۔ بغداد جسے دنیا کا بہترین شہر کہا جاتا تھا۔ الف لیلیٰ کا شہر، دارالسلام، جسے جنت سے تشبیہ دی جاتی تھی، برق رفتار دشمن لشکر نے مٹا کر خاک اور راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ تاریخ سے یہ بات بھی ثابت ہوئی ہے کہ ہلاکو کی ایک چہیتی عیسائی بیوی تھی جس کی خواہش پر ہلاکو نے اسلامی طاقت کو مٹانے کا عزم کیا تھا۔ یورپ کے صلیب پرستوں سے ساز باز کی تھی۔ ایک حد تک یہ روایت درست بھی ہے کیونکہ مسلمانوں کے ساتھ صلیبی جنگوں میں ہزیمت اٹھانے والی یورپی اقوام اور روم کے پاپائے اعظم نے ہلاکو کو مسلسل کمک فراہم کی تھی تاکہ مسلمانوں سے انتقام لیا جا سکے۔ یہ بھی درست ہے کہ سقوط بغداد کے وقت عیسائی فوجی تاتاریوں کے شانہ بشانہ مسلمانوں کے قتل عام اور لوٹ مار میں شریک تھے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ مسلمانوں کی کرتوتوں اور بداعمالیوں کے باعث وقوع پذیر ہوا یا پھر مسلمانوں کا عروج زوال میں بدلنا شروع ہو گیا تھا کیونکہ یہ بھی قانون قدرت ہے۔

ہلاکو کی فتح میں بغداد کے وزیر ابن علقمی نے نمایاں کردار ادا کیا۔ وہ بادشاہ کو غلط مشورے دیتا۔ اس کی غداری سے مسلمانوں کو تاریخ میں بدترین کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ سلسلہ یہیں نہیں رکا جب مسلمانوں نے دوبارہ عروج حاصل کیا تو غیروں کو شکست دینے کے بعد انہوں نے بھی غداری کر دی جس کی واضح

مثالیں میر جعفر اور میر صادق ہیں۔

جب کسی قوم پر ایک بار عذاب آجائے تو وہ کبھی پہلی حالت پر بحال نہیں ہوتی۔ یہ قانون قدرت ہے۔ اس لیے بھی کہ مسلمانوں نے دوبارہ اپنی حالت بدلنے کی واقعی کوشش بھی نہیں کی۔ مسلمانوں پر تیسرا عذاب انسانی شکل میں تیمور لنگ تھا۔ تاریخ اسے انسانی کھوپڑیوں کا مینار بنانے والے کا خطاب دیتی ہے۔ وہ اس کا مستحق بھی تھا۔ وسط ایشیاء اور ایران کے جن جنگی میدانوں اور صحراؤں میں اس نے یہ مینار بنائے وہاں زیادہ تر کھوپڑیاں مسلمان سپاہیوں اور بے گناہ شہریوں کی تھیں۔ چودھویں صدی کے آخری دو عشروں اور پندرھویں صدی کے آغاز میں تیمور کی شکل میں چلنے والے فوجی جھگڑے نے مشرق ومغرب میں دنیا کو زیروزبر کر دیا۔ اس سے پہلے تاتاری فاتحین چنگیز خان اور ہلاکو نے بھی یہی کچھ کیا تھا۔ وہ صدیاں گزرنے کے باوجود مسلمانوں نے کوئی سبق حاصل نہ کیا بلکہ حالات پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو گئے۔ دنیا میں عبرت اور نصیحت نہ پکڑنے والی قوموں پر عذاب نازل کیا جاتا ہے۔ ضروری نہیں ان پر آسمان سے پتھر برسیں' زمین الٹا دی جائے یا پہاڑ سرک کر آبادی کے اوپر گر جائیں۔ تیمور کی سب سے بڑی فتح عثمانی ترکوں کے بادشاہ بایزید یلدرم کے خلاف تھی۔ وہ بہت طاقتور فوج رکھتا تھا اور اگر تیمور اس کے خلاف محاذ جنگ نہ کھولتا تو وہ یورپ کو فتح کرنے میں یقیناً کامیاب ہو جاتا۔ تیمور نے اسے بارہا اطاعت کی دعوت دی لیکن اس نے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا۔ دونوں فوجوں کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی' اس جنگ میں تیمور نے محض بہتر حکمت عملی کی وجہ سے بایزید کی فوج پر فتح حاصل کی۔ اس کے بعد تیمور نے لاکھوں مسلمانوں کو بے رحمی سے قتل کیا اور ان کی کھوپڑیوں کے مینار بنائے گئے۔ وہ ایک ظالم اور درندہ صفت آدمی تھا جس کا اعتراف اس نے خود ان الفاظ میں کیا

> ''میں یہ بات نہیں چھپانا چاہتا کہ اپنے دشمنوں کا خون بہتا دیکھ کر مجھے ایک خاص لذت کا احساس ہوتا ہے' ایسی لذت جو دوسرے لوگوں کو شراب پی کر محسوس ہوتی ہے۔''

مسلمانوں کی تاریخ کو ان میں تین تاتاری حکمران نے اتنا نقصان پہنچایا کہ آج بھی اس کے اثرات محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ مگر اس کی بنیادی وجہ مسلمانوں میں نااتفاقی تھی۔ بعض اوقات چھوٹے معاملات اور ذاتی ناچاکیاں تاریخ میں بڑے سانحات کو پیدا کرتی ہے۔ کسی قوم یا حکمران کو ہمیشہ غلبہ حاصل نہیں ہوتا اور قوموں کے درمیان ایام میں تغیر وتبدل ہوتا رہتا ہے قانون قدرت یہ بھی ہے کہ جب

تک کوئی قوم خود اپنے اندر تبدیلی کا خیال پیدا نہیں کرتی اس کی حالت تبدیل نہیں ہوتی ۔قدرت کا کوڑا برستا ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے عبرت کے نشان چھوڑ جاتا ہے۔یہ کوڑا کبھی ہلاکو' چنگیز' تیمور' نادر شاہ یا پھر آپس میں لڑ مرنے کی صورت میں نازل ہوتا ہے۔قدرت کی طرف سے یہ عذاب اس وقت نازل ہوتا ہے ۔ جب اصلاح کا جذبہ اجتماعی طور پر ختم ہو جائے یا اصلاح کی طرف متوجہ کرنے والی مٹھی بھر عناصر کی بات نہ سنی جائے بلکہ ان کی تذلیل کی جائے۔آج کئی صدیوں کے بعد بھی ہم نے کوئی سبق حاصل نہ کیا۔آج بھی مسلمانوں کو رسوائی و ذلت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہے ان کا خون پانی سے بھی کم اہمیت رکھتا ہے۔اب وقت کی ضرورت ہے کہ ہم سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام کر دلوں میں پھر وہی جذبہ ایمانی اجاگر کر کے دنیا کے سامنے ایک فاتح قوم کے طور پر آئیں اور یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب ہم قرآن وسنت کے مطابق زندگی بسر کریں گے۔

سقوط غرناطہ

زندہ قوموں کی خصوصیات میں سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے ماضی اور حال پر تنقید کر کے مستقبل کو روشن کرتی ہیں۔ کسی قوم کے ذہنی طور پر "بالغ" ہونے کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو اپنے ماضی اور حال کو تنقید کا موضوع بنائے اور اگر خود میں کوئی خامی نظر آئے تو اس کی ذمہ داری دوسرے افراد یا کسی دوسری قوم پر ڈالنے کی بجائے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ اس کی شکست ور یخت میں خود اس کا اور اس کی قوم کے دیگر افراد کا کیا کردار ہے۔ زندہ قومیں اس قسم کے تجزیئے اور تنقید سے اہم نتائج اخذ کرتی ہیں اور ماضی و حال کی خامیوں اور غلطیوں کو سمجھ کر مستقبل کے لیے صحیح راستے تلاش کرتی ہیں۔ وہ کوشش کرتی ہیں کہ اگر تاریخی عوامل نے انہیں شکست و زوال کی منزل پر کھڑا کر دیا ہے تو وہ مزید تباہی کا راستہ اختیار نہ کریں بلکہ نئی راہیں تلاش کریں۔ جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو وہ خود احتسابی سے گریز کرنے لگتی ہے اور اپنی تمام ناقدانہ صلاحتیں دیگر اقوام کی تنقید پر صرف کرنے لگتی ہے ۔اس ذہنیت نے کئی قوموں کو تباہ کر ڈالا جس میں سر فہرست مسلمان ہیں۔ جنھوں نے دوسروں کو اپنی بربادی کا ذمہ دار ٹھہرایا اور اپنی خامیوں پر قابو پانے کی کبھی کوشش تک نہ کی۔ ہم یہاں مسلمانوں کے عروج و زوال کی دردناک کہانی پیش کریں گے جو ہسپانیہ میں وقوع پذیر ہوئی۔

"ایک دن موسیٰ بن نصیر جمعہ کے بعد اپنے مشیروں کے ساتھ بیٹھے تھے کہ پڑوسی سلطنت کے حکمران "راڈرک" کے وزیر کونٹ جولین فریادی بن کران کے پاس آئے اور شکایت کی کہ بادشاہ راڈرک نے اس کی بیٹی کی عزت لوٹ لی ہے۔ موسیٰ بن نصیر اور ان کے غیور مشیروں پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ موسیٰ بن نصیر چونکہ بڑے حساس غیور اور منصف حکمران تھے اس لیے وہ ظالم راڈرک کے خلاف کاروائی کرنے پر تل گئے لیکن اس کی اجازت خلیفہ ولید سے حاصل کرنا ضروری تھی کونٹ جولین جذباتی ہو کر بول اٹھا کہ "ہم آپ مسلمانوں کے پاس ظالم کے خلاف عدل و انصاف کے فریادی بن کر آئے ہیں اگر آپ نے

بھی ہماری مدد نہ کی تو میں حضرت یسوع مسیح کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں بے غیرتی کے سبب سمندر میں ڈوب کر مروں گا اور میرا خون ناحق آپ کے سر ہوگا۔"

موسیٰ بن نصیر نے اس صورتحال سے خلیفہ ولید کو آگاہ کیا اور راڈرک کے خلاف فوجی کاروائی کی اجازت کے لیے ایک ایلچی کو خط کے ساتھ دمشق روانہ کیا اس وقت مشکل یہ تھی کہ اندلس جاتے ہوئے راستے میں سمندر پڑتا تھا جسے بغیر جہازوں کے عبور کرنا انتہائی مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ بحرہ روم نے افریقہ کو اندلس سے جدا کر رکھا تھا اور مسلمانوں نے آج تک سمندر میں جہاز رانی نہیں کی تھی اور نہ اس کا تجربہ تھا۔ چنانچہ جہازوں کی تیاری کا حکم دے دیا۔ عیسائی شاہ راڈرک سے جنگ کرنے کا شوق ہر مسلمان کے دل میں مچل رہا تھا اب یہ بھی مسئلہ تھا کہ کتنی فوج اندلس بھیجی جائے اور اس کا سالار کون ہوگا موسیٰ بن نصیر خلیفہ ولید کے اجازت نامے کے انتظار کے ساتھ فوجی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ انہیں تیاریوں کے دوران قاصد خط لے کر واپس آیا۔ خلیفہ ولید نے ان الفاظ میں جواب دیا "اندلس کی مہم کے لیے آپ کو کلی اختیار ہے کہ بڑی دانشمندی و ہوشیاری کے ساتھ ظالم راڈرک کے خلاف کاروائی شروع کر دو بہادر و تجربہ کار کمانڈر کا انتخاب کرو جو اس مہم کے لیے مناسب و موزوں ہو۔"

اس حکم نامے کو پڑھ کر موسیٰ بن نصیر نے دمشق کی جامع مسجد میں خطبہ جمعہ دیتے ہوئے یہ اعلان کیا "سب لوگوں کو یہ بات معلوم کرنے کا اشتیاق ہے کہ اندلس جانے والے لشکر کا سپہ سالار کون ہوگا میرے پاس درجنوں نام ہیں، ہر بہادر چاہتا ہے کہ یہ اعزاز اسے حاصل ہو ان میں میرا بیٹا عبدالعزیز بھی ہے جو بہادر ہونے کے ساتھ کئی جنگوں میں سپہ سالاری کا کامیاب تجربہ بھی کر چکا ہے لیکن میں نے اس جرنیل کا خطاب کیا ہے جو اس مہم کے لیے سب سے موزوں و مناسب ہے اور وہ ہے ایک بربر غلام جسے میں نے آزاد کر کے اندلس جانے والی فوج کا سپہ سالار بنا دیا ہے اور اس کا نام ہے "طارق بن زیاد" جب مسلمانوں نے بربر قبائل پر لشکر کشی کی تھی تو یہی غلام اپنے ملک و قوم کی حفاظت کے لیے نہایت بہادری سے لڑا تھا اور لڑتے ہوئے گرفتار ہو گیا تھا چونکہ اس زمانے میں یہ جنگی دستور تھا کہ جو سپاہی میدان جنگ میں لڑائی کے دوران گرفتار ہو جاتا تو اسے غلام بنا لیا جاتا تھا یہ غلام (طارق بن زیاد) موسیٰ بن نصیر کے حصے میں آیا۔ مسلمانوں کے حسن اخلاق گورنر موسیٰ کی شفقت نے اسے ایمان لانے کی ترغیب دی اور وہ مسلمان ہو گیا کچھ عرصے بعد اس کی انتظامی صلاحیتوں اور اخلاقی خوبیوں کی بنا پر اسے مراکش کا گورنر بھی بنا دیا تھا اس کی بہادری و دانشمندی کے عام چرچے تھے اس لیے اندلس کی مہم کے لیے

سپہ سالاری کا قرعہ فال ان کے نام نکلا۔

یہ لشکر جو اندلس جا رہا تھا، پیدل تھا کیونکہ اتنے جہاز تیار نہ ہوئے تھے جو کہ گھوڑوں کے لیے بھی کفایت کرتے۔ اس لیے نصف فوج پیدل ہی سفر طے کر رہی تھی۔ جو لشکر جا رہا تھا اس کے ہشاش بشاش چہروں سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مظلوم وستم رسیدہ بہن کی عزت کی پاسبانی کا فرض ادا کرتے ہوئے روحانی تسکین ومسرت محسوس کرتے ہیں حالانکہ یہ لشکر اجنبی و بدیسی سرزمین پر قدم رکھنے والا تھا جہاں ہر باشندہ ان کے خون کا پیاسا تھا۔ دوسرا ان کے دشمنوں کی تعداد کا کوئی اندازہ نہیں ان کا ملک تھا، جتنی مرضی افرادی قوت اور جنگی سامان تیار کر لیتے، دوسری طرف مسلمان اپنے ملک سے کوسوں دور، درمیان میں سمندر حائل، کسی قسم کی مدد پہنچنے کی امید نہیں تھی۔ بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ مجاہدین کے پاس نہ زرہ بکتریں تھیں، نہ تلواریں اور نہ ہی ڈھالیں۔ جنگی گھوڑے بھی نہ تھے اور سات ہزار فوج تھی جو ایک لاکھ سے زائد کیل کانٹے سے لیس فوج سے ٹکر لینے جا رہی تھی۔ بہر حال اسلامی لشکر ساحل سمندر پر پہنچ گیا سامنے صرف چار جہاز کھڑے تھے ان کے ارد گرد چھوٹی چھوٹی کشتیاں سمندر میں تیر رہی تھیں۔ رخصت کرنے والے مجاہدین سے گلے مل رہے تھے۔ بڑا رقت آمیز منظر تھا۔ ہر شخص کے لبوں پر دعائیہ کلمات اور خلوص بھری دعائیں تھیں۔ اللہ اکبر کی گونج میں اسلامی پرچم جہازوں پر لہرائے گئے۔ بادبان کھول دیئے گئے۔ لنگر اٹھا لیے گئے مجاہدین نے ہاتھوں کے اشارے سے ساحل پر کھڑے مسلمانوں کو آخری سلام کیا جب تک جہاز نظر آتے رہے مسلمان ہاتھ آسمان کی طرف اور سر سجدے میں ڈالے ہوئے ان کی فتح ونصرت کی دعائیں مانگتے رہے۔

مسلمانوں کا یہ قافلہ اندلس کی سرزمین پر اپنے قدم رکھ چکا تھا طارق بن زیاد نے اپنے مجاہدین کو حکم دا کہ وہ ان جہازوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیں۔ مجاہدین نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد طارق بن زیاد نے ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا "مسلمانو! اب تمہاری واپسی کا کوئی ذریعہ کوئی وسیلہ نہیں رہا، اب دو ہی راستے ہیں، ایک یہ ملک (اندلس) فتح کر کے یہاں آباد ہو جاؤ یا پھر شہید ہو کر جنت میں بسیرا کرلو۔"

مسلمانوں نے عیسائیوں کے ساتھ پہلا معرکہ بڑی بہادری سے جیت لیا۔ اس معرکہ میں 11 سو عیسائی واصل جہنم ہوئے اور صرف 19 مسلمان شہید ہوئے۔ راڈرک نے مسلمانوں کو کچلنے کے لیے ملک بھر سے نوے ہزار آزمودہ کار لشکر جرار جمع کیا اور سرزمین عرب سے آئے ہوئے مٹھی بھر نیم مسلح سرفروشوں کے مدمقابل لا کھڑا کیا۔ مسلمانوں کے پاس صرف سات سو گھوڑے تھے۔

پانچ ہزار سپاہیوں کی دمشق سے جونئی کمک آئی تھی، اس کے پاس بھی ہتھیار مکمل نہ تھے۔ طارق بن زیاد کا حکم سنتے ہی بڑے جوش و جذبے سے کفار کا رخ کیا۔ ادھر عیسائیوں کا لشکر سمندر کے طوفانوں کی طرح اُمڈا چلا آ رہا تھا۔ ان کے ہمراہ کوہ پیکر گھوڑوں کی لمبی قطار برق رفتاری سے یلغار کر رہی تھی ایسا دکھائی دیتا تھا کہ وہ آتے ہی مسلمانوں کو کچل کر رکھ دیں گے۔ مسلمانوں نے اپنی فوجوں کو دور دور تک پھیلا دیا تھا۔ دونوں فوجوں میں ایک دس کا فرق تھا یعنی ایک مومن کے مقابل میں دس کفار تھے۔ عیسائیوں کو علم تھا مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے اور اسلحہ بھی ناکافی وہ اپنی عددی اور اسلحی برتری کے گھمنڈ و غرور میں سرشار جھومتا نازنخرے کے ساتھ بڑھتا چلا آ رہا تھا لیکن اسے معلوم نہ تھا سامنے اللہ کے غلام صرف اللہ کے بھروسے اور ایک اعلیٰ و ارفع مقصد کے سایہ تلے اطمینان قلب کی بھرپور دولت کے ساتھ مد مقابل ہیں۔ الغرض صبح سے شام تک خون ریز جنگ ہوتی رہی۔ نقشہ کچھ یوں تھا کہ ایک مومن پر دس کافر تلوار زنی کر رہے تھے لیکن ہوتا یوں کہ جب ایک مسلمان ایک بار تلوار مارتا تو اس کی ضرب سے چھ کافر سامنے تڑپتے نظر آتے۔ آخر کار نتیجہ وہی رہا جو غزوہ بدر میں دیکھا گیا۔ کفر کی کثرت پر ایمان کی طاقت نے غلبہ پایا۔ راڈرک میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ مسلمانوں نے فوج کا پیچھا کیا۔ اس طرح جنگ فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ کفر پر ایمان کی ضرب کاری نے دھوم مچا دی۔

راڈرک کی عبرتناک شکست کے بعد عیسائیوں کے حوصلے اس قدر پست ہوئے کہ اس کے بعد وہ کسی بھی میدان میں جم کر نہ لڑ سکے۔ دارالخلافہ طلیطلہ پر قبضہ ہونے کے بعد قرطبہ اور دوسرے چھوٹے بڑے شہر یکے بعد دیگرے فتح ہوتے گئے۔ اور پھر وہ دن آیا جب پورا اندلس یا ہسپانیہ مسلمانوں کے قدموں تلے ڈھیر ہو گیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اندلس پر ایک ہزار سال کے طویل عرصہ تک اسلام کا پرچم پوری آن و شان کے ساتھ لہراتا رہا لیکن یہ قانون قدرت ہے کہ عروج کسی پر بھی ہمیشہ نہیں رہتا اور یہی مسلمانوں کے ساتھ اندلس میں ہوا تھا، اب ہم مسلمانوں کے زوال کے پس منظر کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں کی بداعمالیوں' بے حسی' بے اعتدالیوں' ہوس پرستوں' باہمی تنازعات اور اسلامی مفادات سے روگردانی کے سبب ہسپانیہ میں اسلامی طاقت و قوت کا شیرازہ تیرہویں صدی عیسوی کے شروع میں ہی تسبیح کے دانوں کی طرح بکھرنے لگا تھا۔ 1212ء میں عیسائی حکمران الفانسو ہشتم اور مسلمان حکمران محمد بن یعقوب کے درمیان طولوشہ کی مشہور جنگ میں مسلمانوں کی ساٹھ ہزار تجربہ کار فوج عیسائیوں کے مقابلے میں شکست کھا گئی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کے صرف

ایک ہزار سپاہی جان بچا کر بھاگ سکے۔ یہ وہ دور تھا جب ایشیا میں چنگیز خان کی فوجوں کے سامنے مسلمانوں کی ہوا اکھڑ رہی تھی۔ اس جنگ کے بعد مسلمانوں کی حالت اندلس میں پتلی ہوتی چلی گئی درمیان کے تین سو سالوں میں کبھی کبھار مختلف اور غیر متوقع ذرائع سے انہیں کچھ اس طرح مدد ملتی رہی جیسے دم توڑتے مریض کو تھوڑے عرصے کے لیے زندہ رکھنے کے لیے آکسیجن دی جاتی ہے۔ اندلس میں جو کچھ مسلمانوں پر گزری' غیروں کے علاوہ اپنوں نے ان پر کیا کیا ظلم ڈھائے؟ سینکڑوں سال تک حکمران رہنے کے باوجود مغرب سے مسلمانوں کو جلاوطن کیوں کر دیا گیا؟ تمام یورپ کو علم و ثقافت اور تہذیب کی روشنی سے منور کرنے والوں کے لیے ایک دن مساجد میں اذان دینا ممنوع کیوں ٹھہرا؟

جزیرہ اندلس میں بطور مسلمان فاتح پہلا قدم طارق بن زیاد نے رکھا جو موسیٰ بن نصیر کا پروردہ تھا بعد میں طارق بن زیاد سے موسیٰ بن نصیر کی کچھ شکر رنجی ہوئی بلکہ نئے خلیفہ سلمان نے اسے معزول اور معتوب کیا۔ یہی حال ہندوستان کے فاتح محمد بن قاسم کے ساتھ انہی دنوں ہوا۔ کاش خلیفہ سلمان ان دو جرنیلوں سے یہ سلوک نہ کرتا تو آج تاریخ مختلف ہوتی۔ موسیٰ بن نصیر کے جانے کے بعد امیر عبدالعزیز بن موسیٰ نے اندلس میں فوج کی کمان سنبھالی اور انہوں نے عیسائیوں کے بعض انتہائی مضبوط قلعے تسخیر کر لیے۔ وہ ایک لائق حکمران تھا لیکن حاسدوں نے ان کے خلاف بھی سازشیں کیں اور خلیفہ سلیمان نے عبدالعزیز کا اگر کوئی جرم تھا تو یہ کہ اس نے اندلس کو اسلامی اثر میں لانے کی ایک بہترین سکیم تیار کی تھی اگر اسے حکومت کرنے کا موقع ملتا اور اس سکیم پر عملدرآمد ہوتا تو اندلس کے تمام عیسائی دین اسلام قبول کر لیتے۔ اس نے یہ قانون بنایا تھا کہ اگر کوئی عیسائی اسلام قبول کر لیتا تو اسے آزاد سمجھا جاتا اور اس کی آزادی کی ضمانت حکومت دیتی۔ اس زمانے میں بے شمار غلام ہوتے تھے چنانچہ اس کے چند روزہ دور میں مقامی آبادی کی بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا۔

اس کے بعد مسلمانوں میں باہمی نا چاقی عروج پر پہنچ گئی۔ سلطنت اندلس کئی ریاستوں میں بٹ گئی۔ تقسیم در تقسیم اور باہمی آویزشوں کے نتیجے میں تشکیل نو پانے والی اندلس کی ریاستوں میں سب سے بڑی اشبیلیہ کی ریاست تھی جس میں بعد میں قرطبہ کی ریاست بھی شامل ہو گئی۔ بجا طور پر عیسائیوں کی متحدہ طاقت کا نشانہ یہی ریاست بنی۔ اس ریاست کا حکمران المعتمد دوسری مسلمان ریاستوں سے مایوس ہو کر مجبور ہو گیا کہ ہمسایہ اور طاقتور ترین عیسائی ریاست ''لیون'' کے بادشاہ انفانسو ششم کو سالانہ معقول رقم بطور خراج میں ادا کرے۔ انہی دنوں الفانسو نے طلیطلہ کی ریاست پر حملہ کر کے اسے ہڑپ کر لیا۔ طلیطلہ میں

مسلمانوں کی شکست بہت بڑا المیہ تھی۔ اب مسلمانوں کو اپنی دوسری ریاستوں کا انجام قریب دکھائی دے رہا تھا۔

انہیں دنوں ایک اور مسلمان ریاست ''باربستر و'' پر عیسائی ریاست کے حکمران پیڈ رو نے قبضہ کرلیا اور مسلمان ریاستوں یا ان کے سرحدی علاقوں پر عیسائی فوج کے قبضے کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ مسلمانوں کی کیفیت ان دنوں میں ایسی تھی، جیسے بھیڑیئے کو دیکھ کر شتر مرغ اپنی گردن ریت میں چھپالیتا ہے۔ ابھی تک مسلمانوں کی یہ حالت تھی کہ آپس میں ریاستیں چھیننے میں لگے ہوئے تھے۔ ایک ریاست دوسری ریاست کے خلاف اہل کلیسا سے مدد لیتی تھی اور اہل کلیسا عوض میں ہر ریاست سے بھاری تاوان وصول کیا کرتے۔

امید کی آخری کرن یوسف بن تاشفین کی صورت میں نظر آئی۔ مسلمان سرداروں اور حکمرانوں نے یوسف کا اشبیلیہ کے دروازوں پر استقبال کیا۔ مگر دل میں یہی خواہش تھی کہ عیسائیوں کو شکست دیتے ہی یوسف واپس افریقہ چلا جائے۔ امیر المومنین یوسف بن تاشفین کی خبر پر معتمد کو الفانسو نے خط لکھا اور پوچھا کہ تم نے ہماری رائے اور مشورے کے بغیر یوسف کو کیوں طلب کیا ہے کیونکہ دونوں کے درمیان خراج کی ادائیگی کے تحت معاہدہ صلح موجود تھا۔ اس کے جواب میں معتمد نے جواب دیا ''مجھے سوروں کی پاسبانی کے مقابلے میں اونٹوں کی نگہبانی زیادہ پسند ہے۔ اس میں اشارہ یہ تھا کہ ہسپانوی عیسائی سور پالتے تھے جب کہ افریقی بربر اونٹ چراتے تھے۔ زلاقہ کے مقام پر الفانسو کی زیر قیادت متحدہ عیسائی لشکر اور یوسف کی زیر قیادت بربری، حبشی اور اندلسی مسلمانوں پر مشتمل فوج کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی۔ یہ جنگ رمضان کے مقدس مہینے میں لڑی گئی۔ عیسائیوں کی تعداد تقریباً ساٹھ ہزار جب کہ مسلمانوں کی تعداد بیس ہزار تھی۔ معتمد اپنی فوج کے ساتھ جان توڑ کر لڑا۔ کثرت تعداد کے باوجود عیسائی سپاہ کو شکست ہوئی۔ الفانسو شدید زخمی ہوا۔ بیس ہزار عیسائی قتل ہوئے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں نے عیسائیوں کا ان کی ریاستوں تک پیچھا نہ کیا۔ یوسف کو فوری طور پر افریقہ جانا پڑا۔ ویسے اندلس کے سردار چاہتے بھی یہی تھے لیکن ان کے جاتے ہی عیسائیوں نے دوبارہ شرارتیں شروع کر دیں۔ اس مرتبہ معتمد بنفس نفیس خود افریقہ میں یوسف کو بلانے کے لیے گیا۔ اس مرتبہ یوسف کی دوبارہ آمد کا نتیجہ یہ نکلا کہ اندلس میں باقاعدہ مرابطین کی حکومت قائم ہوگئی۔ سب سے پہلے منتشر مسلمان ریاستوں کو دعوت دی گئی کہ وہ عیسائیوں کے مقابلے میں ایک متحدہ اسلامی طاقت کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں لیکن اس

دعوت کو ٹھکرا دیا گیا، اس پر یکے بعد دیگرے علمائے دین کے فتاویٰ کے بعد ان ریاستوں کو فتح کر لیا گیا اور افریقہ کی مرابطین سلطنت کے ساتھ الحاق کر دیا گیا۔ اندلس کے مسلمانوں کو طبقہ "اشرافیہ" نجات دہندہ یوسف بن تاشفین کو جاہل اور وحشی سمجھتا تھا کیونکہ وہ عربی پر عبور نہ رکھتے تھے جب کہ عوام ان کی مداح تھی۔ ردعمل کے طور پر اعلیٰ طبقوں اور سابقہ حکمرانوں کی اولاد نے مرابطین کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کر دیں اور مقامی عیسائیوں کو مرابطینی مجاہدین پر ترجیح دینے لگے۔ یوسف کی کامیابیوں کو دیکھ کر اندلسی ریاستوں کے سرداروں نے آپس میں فیصلہ کیا تھا "آئندہ مرابطین کو فوجیں اور سامان رسد ہرگز نہیں دیا جائے گا اور یہ فیصلہ کیا کہ اندلس کی تمام اسلامی ریاستیں لیون کی عیسائی بادشاہ الفانسو سے اتحاد کر لیں۔"

جب کسی قوم میں ایسی خرابیاں پیدا ہو جائیں تو اس کی تباہی یقینی ہو جاتی ہے۔ حالت یہ ہوئی کہ 1121ء میں قرطبہ کے شہریوں نے مرابطینی فوج کی چھاؤنی پر حملہ کر دیا اور بے شمار فوجیوں کو قتل کرنے کے علاوہ ان کے گھروں کو بھی لوٹ لیا۔ اگر کوئی نادر شاہ یا تیمور جیسا حکمران ہوتا تو شہر کی اینٹ سے اینٹ بجانے کا حکم دے دیتا لیکن مرابطینی ظالم نہ تھے۔

الارکوس کی فتح اندلس میں مسلمانوں کی آخری کامیابی تھی۔ قدرت نے اپنے انعام اور مدد کی ناشکری کرنے پر انہیں سزا دینے کی ٹھان لی۔ اس کے بعد مسلمان پیچھے ہٹتے گئے جب کہ عیسائی نے خود احتسابی کر کے اپنی منتشر صفوں میں اتفاق و اتحاد پیدا کر لیا۔ طولوشہ کی جنگ نے مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس جنگ میں عیسائیوں نے الارکوس کا بدلہ لے لیا۔ ساٹھ ہزار فوج میں سے ایک ہزار جان بچا کر بھاگ سکے۔ خلیفہ محمود بن یعقوب جان بچا کر سمندر عبور کر کے مراکش چلا گیا۔ طولوشہ کی جنگ میں مسلمانوں کا ایک گروہ عین اس وقت غداری کر کے عیسائیوں سے جاملا جب مسلمانوں پر شدید دباؤ تھا۔ اس غداری سے مسلمانوں کو ایسا شدید جھٹکا لگا کہ وہ دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑے نہ ہو سکے۔ عیسائیوں نے مسلمانوں کی طرح جنگ کے بعد آرام سے بیٹھ جانے کی غلطی نہ کی۔ مسلمانوں کی رواداری کے برعکس الفانسو نے یہ حکم دیا کہ جو عیسائی جان بوجھ کر قابو آئے ہوئے مسلمان کو چھوڑے گا، اسے موت کی سزا دی جائے گی۔ چنانچہ طولوشہ کی جنگ میں کوئی زندہ قیدی نہ بنایا گیا۔ جو مسلمان ہاتھ لگا، اسے بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔

مختصر یہ کہ مسلمان غرناطہ تک محصور ہو کر رہ گئے۔ وہ اس قدر پریشان تھے کہ ان کے دماغ کوئی فیصلہ

کرنے سے بھی قاصر تھے۔ یہ دسمبر 1491ء کے دن تھے اور حد سے ٹھنڈی راتیں۔ برفباری سے تمام راہیں بند ہوگئیں اور شہر میں رسد پہنچنی بند ہوگئی۔ ایک دن غرناطہ کے کچھ شہریوں نے جمع ہوکر ابوعبداللہ سے درخواست کی کہ اس طرح فاقوں سے خود کو ہلاک کرنے سے بہتر ہے کہ باہر نکل کر مردوں کی طرح لڑا جائے۔ یا کامیاب ہوں گے یا پھر شہید۔ ابوعبداللہ نے امرائے سلطنت سے مشورہ کیا۔ یہ وہ لوگ تھے جن میں سے اکثر کو خفیہ طور پر دشمن نے پہلے ہی خرید لیا تھا۔ امراء کو صرف اپنی جاگیروں اور دولت کے تحفظ کی غرض تھی جب کہ غریب اور بھوکے عوام کے لیے پیسہ اور روٹی دین و ملک پر مقدم تھی۔ رہا درمیانہ طبقہ تو اسے کوئی پوچھتا نہ تھا۔ اس طبقے کی ہمتیں جواب دے چکی تھیں۔ تباہی اچانک نہیں آیا کرتی۔ مکمل تباہی سے پہلے قوموں کی اخلاقی زندگی ختم ہوجایا کرتی ہے۔ وہاں کے حکمران طبقے نے مال و جان کی حفاظت کی ضمانت لے کر اپنی سلطنت ان کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا۔ یکم جنوری 1492ء کی صبح کو جب ابوعبداللہ نے لوگوں میں آثار بغاوت دیکھ کر عیسائی متحدہ کمان کو غرناطہ کی صورت حال کیا تھی؟ غرناطہ اس وقت آٹھ دس لاکھ آبادی والا شہر تھا۔ شہر میں ہتھیاروں اور ہتھیار بنانے والے کارخانوں کی کمی نہ تھی۔ مسلمانوں کی فوج کی تعداد تیس ہزار تھی جو شہر کی حفاظت کر رہی تھی۔ ہزاروں کی تعداد میں رضا کار بھی اس لڑائی میں شامل ہوسکتے تھے۔ اس قسم کا شرمناک معاہدہ کر کے اپنے آپ کو عیسائیوں کی غلامی میں دے دینا بے حسی کی انتہا تھی۔ عیسائیوں نے مجبور نہیں کیا تھا لیکن ابوعبداللہ نے ساٹھ دن کی مقررہ میعاد سے پہلے ہی 2 جنوری 1492ء کو غرناطہ دشمن کے حوالے کر دیا۔ یکم اور دو جنوری مسلمانوں کے لیے قیامت کے مناظر کے دن تھے۔ ملکہ ازابیلا اور بادشاہ فرڈی ننڈ کے لیے یہ عید رات تھی۔ اب ان غدار مقامی مسلمانوں کو بھی اپنے آخری انجام کا اندازہ ہو رہا تھا جنہوں نے انعام و اکرام کے وعدوں پر قوم کی پیٹھ میں خنجر گھونپا تھا۔ فاتح غرناطہ کو قصر الحمرا میں داخل ہوتے دیکھ کر ابوعبداللہ اپنے گھوڑے سے اتر پڑا اور اس کے گھوڑے کی باگ تھام لی' ساتھ ہی اندلس کی آٹھ سو سالہ اسلامی روح پرواز کر گئی۔ غرناطہ کی چابیاں کانپتے ہاتھوں سے دشمن کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے ابو عبداللہ نے کہا "یہ چابیاں اندلس میں عربوں کی حکمرانی کی آخری نشانی ہیں۔ آپ انہیں لے لیجیے کیونکہ خدا کی مشیت کے مطابق ہمارا ملک' مال اور جانیں سب آپ کی ملکیت میں ہیں۔" "قصر الحمرا" کے سب سے بلند مینار پر مسلمانوں کا ہلالی پرچم اتار کر مکروہ سنہری صلیب نصب کر دی گئی۔

غرناطہ میں ایک کہرام مچا ہوا تھا، مسلمان رو رہے تھے' عیسائی اپنی صلیبوں کے ساتھ بازاروں میں

دندناتے پھرتے تھے لوگوں کو اپنے کل کا کچھ علم نہ تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ افراتفری کا عالم تھا۔ لوگوں کو اپنے حال میں چھوڑ کر ابو عبداللہ غرناطہ کی حدود سے باہر نکل گیا۔ کوئی اسے خدا حافظ کہنے والا موجود نہ تھا۔ معاہدہ کے مطابق اسے ابشارت کی جاگیر کا پروانہ دے دیا گیا تھا۔ اب وہ بشارت کی طرف جا رہا تھا۔ کچھ دور جا کر پہاڑی پر سے اس نے ایک نگاہ واپس غرناطہ پر ڈالی، جہاں اب جگہ جگہ سے دھواں اٹھ رہا تھا اور وہ شدت جذبات سے رو پڑا۔ اس کی ماں نے کہا ''اچھا ہوتا اگر تو ملک کا دفاع مردوں کی طرح کرتا' اب عورتوں کی طرح رونے کا کیا فائدہ!''

ہم مسلمانوں کی تاریخ کو پانچ ادوار میں منقسم کر سکتے ہیں۔ پہلا دور طارق بن زیاد کی آمد سے شروع ہوتا ہے اور 755ء تک جاری رہتا ہے۔ جب دمشق میں بنو امیہ کا تختہ الٹا گیا لیکن ان کا ایک شہزادہ عبدالرحمن الداخل اول کسی طرح جان بچا کر اندلس جا پہنچا اور وہاں حکومت قائم کر لی۔ یہ کوئی چالیس سال کا عرصہ بنتا ہے۔ دوسرا دور عبدالرحمٰن اول سے شروع ہو کر آخری اموی خلیفہ ہشام المویدتک جاتا ہے جو اپنے طاقتور وزراء کے ہاتھوں محض کٹھ پتلی تھا۔ اپنے اختیارات وزیروں کے سپرد کر کے عیش و عشرت میں کھویا ہوا تھا۔ 1036ء میں وہ مر گیا۔ یوں اموی سلطنت اپنے قدرتی انجام کو پہنچی۔ یہ کوئی اڑھائی سو سال سے زیادہ کا زمانہ بنتا ہے۔

اس دور کے آخری دس برس بے حد انتشار اور خانہ جنگی میں گزرے۔ وہی مسلمان جو ابتداء میں جنوبی فرانس اور پرتگال تک پہنچ گئے تھے اب اندلس میں اپنی جمعیت کو یکجا نہیں کر پا رہے تھے۔ مختلف صوبوں میں خود مختار حکومتیں بننا شروع ہو گئیں تھیں اور شمال و مغرب سے عیسائیوں کی متحدہ طاقت انہیں ہڑپ کرنے کے لیے حملے کر رہی تھی۔ تیسرا المرابطین کا دور ہے۔ یوسف بن تاشفین کو مسلمانوں کی مدد کے لیے بار بار اندلس آنا پڑا وہ واپس گیا تو مسلمانوں کو عیسائی کے مقابلے میں پسپائی اختیار کرنا پڑی' انہیں بچانے کے لیے یوسف بن تاشفین نے اندلس میں اپنے قائم مقام کو حکومت سنبھالنے کا حکم دیا۔ یہ دور خانہ جنگی کے واقعات سمیت 1036ء سے لے کر 1147ء تک شمار کیا جاتا ہے۔ اس سو سالہ دور میں ایک بار پھر مسلمانوں کو اندلس میں سنبھالا ملا لیکن اندرونی خرابیاں جو مسلمان معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ رہی تھیں، برقرار رہیں۔ اس لیے عیسائی طاقت نہ صرف برقرار رہی بلکہ مضبوط تر ہوئی۔ چوتھا دور موحدین کا ہے۔ یہ لوگ بھی شمالی افریقہ سے المرابطین کے قدموں کے نشانات پر قدم رکھتے ہوئے آئے تھے اور بنیادی طور پر خالی مجاہد تھے، منتظم نہ تھے۔ ان کا دور 1212ء تک چلا۔ یہ مختصر مگر

ہنگامہ خیز دور تھا۔ اس کے بعد اندلس میں مسلمانوں کی طاقت بالکل بکھر گئی۔ ان کے علاقوں پر عیسائی قابض ہونے لگے۔ صرف غرناطہ کی ایک ریاست بچ رہی تھی لیکن عیسائی پیش قدمی کی زد میں رہی اور بالآخر 1492ء میں اس ریاست کے مرکز پر بھی صلیب لہرانے لگی۔

فلسطین سے اسرائیل تک

مسلمانوں کی تاریخ عروج سے زوال تک بڑی ہی دردناک ہے۔ ایک ایک لفظ پڑھ کر سو سو آنسو آنکھ سے ٹپک جاتے ہیں۔ سب سے المناک بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان کے ملک سے بے دخل کر دیا گیا، جہاں دو صدیوں سے قیام پذیر تھے۔ جہاں ان کے آباؤ اجداد کی خوشبو آج بھی ہواؤں میں پھیلی ہوئی ہے مگر اس کو محسوس کرنے والے جا چکے ہیں ان کے بزرگوں کی قبروں اور ان کی یادوں کو مٹا دیا گیا۔ ان کا ماضی ہمیشہ کے لیے بھلا دیا گیا اور ان کو مہاجر کیمپوں میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ ہم یہ ساری دردناک کہانی اپنے بھائیوں کے متعلق بیان کر رہے ہیں۔ یہودیوں نے فلسطین کی سرزمین پر بڑی ڈھٹائی سے اسرائیل کی ریاست کو قائم کیا۔ قبلہ اول مسجد اقصیٰ میں فلسطینیوں کے قتل عام کی خبر ہر مسلمان کے قلب وروح پر بجلی بن کر گری۔

تمام دنیا کے مسلمانوں نے اس درد کو شدت سے محسوس کیا یہ ہماری تاریخ کے نازک ترین لمحات میں سے ایک لمحہ تھا۔ دوسری طرف اس وقت دنیا میں پچاس سے زائد آزاد مسلم ممالک ہیں جن کی مجموعی آبادی ڈیڑھ ارب کے قریب ہے اور پھر بھی بدبخت یہودی لاکھوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود ظلم و ستم کی انتہا کر رہا ہے یہودیوں کے عزائم کو اچھی طرح جاننے کے لیے ہمیں ان کی تاریخ کو جاننا ہوگا کیونکہ ان کے عزائم کو جاننے کے بعد ہی ہم کوئی حل نکال سکتے ہیں جو ہمارے قبلہ اول کو ان مکار یہودیوں کے قبضہ سے چھڑانے میں مددگار ثابت ہوگا۔

یہودی بیت المقدس کی سرزمین میں تقریباً تیرہ سو برس قبل از مسیح میں داخل ہوئے تھے وہ تقریباً دو صدیوں کی مسلسل جنگ وجدل کے بعد بالآخر رسل پر قابض ہوئے تھے۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہودی اس کے اصل باشندے نہیں ہیں اس کے اصل باشندے دوسرے قبائل وعوام تھے جن کا ذکر بائبل میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ بنی اسرائیل نے ان قوموں کا قتل عام کر کے اس سرزمین پر قبضہ جما

لیا۔اس کے بعد یہودیوں نے اس سرزمین پر قبضہ جمالیا۔اس کے بعد یہودیوں نے اس سرزمین پر تقریباً دو صدیوں تک حکومت کی تھی کہ آٹھویں صدی قبل از مسیح اسیریا نے شمالی فلسطین پر قبضہ کر کے یہودیوں کو بالکل تباہ و برباد کر کے ان کی جگہ پر دوسرا عذاب چھٹی صدی قبل مسیح بخت نصر کی صورت میں نازل ہوا اس نے جنوبی فلسطین پر قبضہ کر کے تمام یہودیوں کو جلاوطن کر دیا۔اس نے بیت المقدس کو زمین بوس کر دیا اور ہیکل سلیمانی جسے دسویں صدی قبل از مسیح میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کروایا تھا اس طرح تباہ کیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ نہ رہی۔اس طرح ایک طویل عرصے کی جلاوطنی کے بعد ایرانیوں کے دور حکومت میں یہودیوں کو دوبارہ جنوبی فلسطین میں آ کر آباد ہونے کا موقع ملا انہوں نے بیت المقدس میں دوبارہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی اس کے بعد انہوں نے وہاں چار سو برس سے زیادہ گزارے۔اس کے بعد 70 عیسوی میں یہودیوں نے رومی سلطنت کے خلاف بغاوت کی۔جس کی پاداش میں بیت المقدس کے شہر سے ہیکل سلیمانی کو بالکل مسمار کر دیا گیا۔پھر دوسری بغاوت کو 135 عیسوی میں کچل کر یہودیوں کو فلسطین سے نکال دیا گیا۔ظہور اسلام سے پہلے تمام فلسطین میں عربی قومیں آباد تھیں اور یہودیوں کا خاتمہ رومی ضروری سمجھتے تھے۔اسی طرح جیسے ہٹلر نے ان کو تباہ و برباد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔رومیوں نے یہودیوں کے فلسطین میں داخلے پر پابندی عائد کی ہوئی تھی۔ان تمام حقائق سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ یہودی ابتدائی نسل کشی کے ذریعے فلسطین میں داخل ہوئے تھے۔جنوبی فلسطین میں ان کے قیام کی زیادہ سے زیادہ مدت 8 سو برس رہی ہے۔اس کے برعکس عرب اقوام شمالی فلسطین میں تین ہزار سال اور جنوبی فلسطین میں تقریباً اڑھائی ہزار برس سے آباد تھے،ان تمام حقائق کے باوجود یہودی اس علاقے کو اپنے آباؤ اجداد کی ملکیت قرار دیتے ہیں۔

اسرائیل برطانیہ اور امریکہ کی سازشوں کا نتیجہ ہے جس میں کافی حد تک مدد روس نے بھی کی تھی،ان سب کی کوششوں کو حقیقت کا روپ اقوام متحدہ نے دیا' جو ہمیشہ سے ہی طاقت ور ممالک کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنی رہی ہے،آج بھی طاقت ور ممالک کسی بھی ناجائز کام کو اس کی منظوری سے جائز قرار دیتے ہیں۔
اسرائیلی ریاست کا قیام دراصل مسلم ممالک کے خلاف ایک سوچی سمجھی سازش ہے جب کہ اس کے قیام کا کوئی بھی تاریخی' اخلاقی اور جمہوری جواز نہیں بنتا' دوسری طرف اس پورے خطے میں مسلم ممالک کا بلاک ہے ان کیخلاف ایک شرارتی ریاست کا قیام مسلم ممالک میں فسادات کا بازار گرم کرنے کا منصوبہ تھا آج بھی اسرائیل کو مغربی ممالک سے اربوں ڈالر کی امداد ہر سال دی جاتی ہے جو اس کے استحکام کا نتیجہ ہے۔

تاریخ سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ یہودی قوم اپنی مخصوص تنگ نظری اور خود کو دوسری اقوام سے بالاتر سمجھنے کی وجہ سے ہر دور میں ذلت و رسوائی کا شکار رہی ہے اس کے جارحانہ عزائم' دوسری اقوام سے نفرت' اپنے مقاصد کے حصول کے لیے دوسری اقوام کی خونریزی سے گریز نہ کرنا یہ وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے اس قوم کو عالمی سطح پر کسی بھی خطے میں پسند نہ کیا گیا اور ساری دنیا میں پھیلے ہوئے اور معاشی ذرائع پر کنٹرول رکھنے کے باوجود یہودی کہیں بھی قومیت کا درجہ حاصل نہیں کر سکے اور نہ ہی کسی ملک وقوم کی قومی وملی تحریک میں شامل ہو سکے۔

نتیجتاً وہ جہاں بھی رہے الگ تھلگ رہے اور علیحدگی کے اس احساس کے تحت خفیہ تحریکیں چلانا اور سازشیں کرنا ان کی فطرت ثانیہ بن گئی وہ انہیں سازشوں کی وجہ سے 667ء میں سرزمین حجاز اور 890ء میں شام سے نکالے گئے انہوں نے پرتگال کو اپنا مرکز بنایا مگر وہاں سے بھی 920ء میں نکالے گئے جس کے بعد وہ سپین میں جا کر آباد ہوئے مگر وہاں سے بھی انہیں 1110ء میں نکال دیا گیا پھر وہ انگلستان میں آباد ہوئے جہاں سے 1290ء میں نکالے گئے۔ ادھر سے ذلیل ہونے کے بعد وہ فرانس میں جا بسے۔ فرانس والوں کے دل 16 برس میں بھر گئے اور انہوں نے یہودیوں کو اپنے ملک سے 1306ء میں نکال دیا۔ وہ بیلجیئم گئے مگر وہاں کے عوام نے انہیں 1370ء میں چیکوسلواکیہ کی طرف دھکیل دیا مگر انہیں صرف دس سال بعد دھکیل کر دوبارہ فرانس کی طرف بھیج دیا گیا۔ 1394ء میں فرانس نے انہیں دوبارہ نکال دیا جس کے بعد وہ ہالینڈ چلے گئے مگر وہاں سے بھی 1442ء میں نکال دیئے گئے جہاں سے وہ روس پہنچے روس نے 1501ء میں ان کو اٹلی کی طرف دھکیل دیا۔ مگر اپنی فطرت کی وجہ سے وہاں بھی پسند نہ کیے گئے اور 1540ء میں جرمنی میں آ کر آباد ہو گئے اور 11 سال بعد یہاں سے بھی نکال دیئے گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انہوں نے اعلیٰ سائنسی تعلیم حاصل کی اور تجارت کو اپنایا۔ اٹھارویں صدی میں کلیسائے انگلستان نے ان کی تذلیل کے لیے انہیں ایک خاص قوم کا لباس پہننے کا پابند بنایا اور لوگوں کو نصیحت کی کہ وہ ان کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے ہوشیار رہیں مگر یہودی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ان کی آبادیاں علیحدہ کر کے ان کے گرد لوہے کی جالیاں لگا دی گئیں۔ بالآخر ایڈورڈ اول یہودیوں کو ملک سے نکالنے پر مجبور ہو گیا۔ اس طرح یہودیوں کو یورپی ممالک نے ذلیل و رسوا کر کے ملک سے نکالا۔ اس وقت تمام یہودی قوم تذبذب کا شکار تھے اور لوگ ان سے انتہا درجے کی نفرت کرتے تھے۔ ان کی اس پریشانی کو ختم کرنے اور ان کو متحد کرنے میں ہرتزل نے بنیادی کردار ادا کیا۔

یہ شخص 1867ء میں پیدا ہوا اور 1902ء میں مرا۔ اس نے 1894ء میں یہودی ریاست کے قیام کے لیے باقاعدہ سرگرمیوں کا آغاز کیا تھا۔ 1894ء میں تھیوڈر ہرتزل نے ایک کتاب ''یہودی مملکت'' تحریر کی اور اس میں واضح طور پر فلسطین میں ''اسرائیل ملک'' بنانے کی بات کی گئی۔ یہودیوں نے ہرتزل کو ''نجات دہندہ'' بنانے کی بات کی۔ یہودیوں نے ہرتزل کو ''نجات دہندہ'' اور ''مسیحا'' قرار دیا گیا۔ 1897ء میں کچھ یہودی لیڈروں نے ''صیہونی ریاست'' تحریک میں جذبہ پیدا کر کے اس کو متحرک کرنے کی کوشش کی گئی اس کے بعد 1897ء میں سوئزرلینڈ کے شہر بانسل میں ایک یہودی کانفرنس ہوئی اس میں مندرجہ ذیل اہداف مقرر کیے گئے۔

1- فلسطین پر قابض برطانوی استعمار کو فلسطین کے اندر یہودیوں کو زرعی اور صنعتی نوعیت کی ملازمتوں کی فراہمی پر آمادہ کرنا۔

2- پوری دنیا کے اندر پھیلے ہوئے یہودیوں کو اپنے اپنے ملک کے حالات کے مطابق تنظیمی لڑی میں پرونا۔

3- یہودی قومیت کے جذبات کی آبیاری کے لیے پروگرام ترتیب دینا۔

4- مختلف حکومتوں کو اپنے اہداف کے حصول کے لیے معاون بنانے کی خاطر خصوصی اقدامات کرنا

اس کے تین اہم نکات طے کیے گئے۔

1- یہودی ریاست کا قیام۔

2- عالمی معیشت پر کنٹرول حاصل کرنا۔

3- عظیم تر اسرائیل کا قیام

ان تمام اہداف کا ٹارگٹ ایک صدی رکھا گیا اور اسرائیل ریاست کے قیام کے لیے فلسطین کا انتخاب کیا گیا ان کے ایک نمائندے نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ وہاں پر عرب آباد ہیں یہودیوں کی آبادی نہ ہونے کے برابر ہے عربوں کو وہاں سے نکالے بغیر اسرائیلی ریاست کا قیام مشکل ہے اس تنظیم کا مقصد یہودی ریاست کے لیے فنڈز اکھٹے کرنا مسلمانوں کے اندر اپنے ایجنٹ پیدا کرنا اور جاسوسی کرنا شامل تھا۔

اس دوران دنیا میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ بہت سی طاقتوں نے عروج حاصل کر لیا، جن میں برطانیہ، فرانس، جرمنی اور امریکہ شامل تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے موقع پر تمام ممالک نے بہت سا جانی

اور مالی نقصان برداشت کیا مگر اس کے باوجود کسی بھی مغربی ملک کا جغرافیہ نہ بدلا مگر ان تمام ممالک سے دور واقعہ سلطنت عثمانیہ سے ٹکر لے کر ان پر قابض ہوگئے۔ انگریزوں نے اپنی کامیاب پالیسی ''لڑاؤ اور جنگ کراؤ'' یہاں بھی آزمائی۔ انہوں نے عربوں کو ان کی قومیت کا سبق پڑھایا۔ ان کو اس بات پر اکسایا کہ وہ ترکوں کی غلامی سے آزاد ہونے کے لیے متحد ہو کر کوشش کریں۔ اس تمام کھیل کا مرکزی کردار برطانوی فوج کا کرنل ''لارنس آف عریبیہ'' تھا۔ اس کا تعلق یہودی نسل سے تھا۔ عیسائیوں اور یہودیوں کی منصوبہ بندی اس قدر مؤثر ثابت ہوئی کہ پہلی جنگ عظیم میں ترک اور عرب ایک دوسرے کے ساتھ شانہ بشانہ لڑنے کی بجائے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن کر سامنے کھڑے ہوگئے۔

پہلی جنگ عظیم کے شروع میں یہودیوں نے جرمنی سے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے معاہدہ کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت یہودیوں کا جرمنی میں اتنا ہی اثر و رسوخ تھا جتنا آج امریکہ میں ہے ان کا جرمنی حکومت سے یہ مطالبہ تھا کہ وہ فلسطین میں یہودی ریاست بنانے میں ان کی مدد کرے مگر ان کو خدشہ تھا قیصر ولیم ایسا نہیں کرے گا کیونکہ ترکی حکومت نے اس جنگ عظیم میں جرمنی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا جرمنی سے مایوس ہو کر یہودیوں نے اپنا سرمایہ اور ساری قوت و قابلیت فرانس اور برطانیہ کے لیے استعمال کرنے کا یقین اس شرط پر دلوایا کہ یہ دونوں ملک فتح یاب ہو کر فلسطین کو یہودیوں کا الگ آزاد ملک بنا دیں گے۔

پہلی جنگ عظیم کے آخری ایام میں برطانوی فوجیں بیت المقدس میں داخل ہو چکی تھیں یہ واقعہ مسلمانوں کے لیے تاریخی اہمیت بھی رکھتا ہے کیونکہ اس مقدس جگہ کے تحفظ کے لیے لاکھوں مجاہدین نے شہادت کا رتبہ حاصل کیا۔ بیت المقدس کے تحفظ کی خاطر صلاح الدین ایوبی نے عیسائیوں کے خلاف کامیاب جنگیں لڑیں۔

جنگ عظیم میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد فرانسیسی فوج جنرل گورو کی قیادت میں دمشق میں داخل ہوئی۔ وہ ایک متعصب اور کٹر عیسائی تھا۔ وہ دمشق میں داخلے کے بعد سب سے پہلے صلاح الدین ایوبی کی قبر پر گیا اور ایک پاؤں قبر پر رکھ کر کہا ''دیکھو صلاح الدین! ہم پھر واپس آ گئے ہیں۔''

یہودی روز اول سے اس حقیقت سے واقف تھے کہ کامیابی ان کے قدم اس وقت تک نہیں چومے گی جب تک عالمی سطح پر موثر ممالک ان کی مدد نہیں کریں گے۔ اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہودیوں نے سب سے پہلے برطانیہ کو اپنے جال میں پھنسایا' برطانیہ نے 6 نومبر 1917ء کو اعلان بالفور کا شوشہ

چھوڑا اور اسرائیل کے ناپاک وجود کو عملاً تسلیم کرلیا۔

برطانیہ اور فرانس نے عرب ملکوں کو تقسیم کر دیا اور یہودیوں کو وہ علاقہ دیا جہاں آج اسرائیل ہے اس طرح اسرائیل کے قیام کی راہ ہموار کی گئی یورپ کے کئی بڑے شہروں میں 1897ء تا 1939ء یہودیوں کے اجتماعات ہوتے رہے اور متعلقہ ممالک کی حکومتیں ان کی حمایت اور سرپرستی کرتی رہیں فلسطین پر برطانوی تسلط کے بعد وہاں پر مردم شماری کرائی گئی اس کے مطابق اس وقت مسلمان عرب 660641 عیسائی عرب 71464 اور یہودی 56709 تھے اور فلسطین کا مجموعی رقبہ 10435 مربع میل تھا۔ نوے فیصد آبادی عربوں کی تھی وہ 97 فیصد رقبہ کے مالک تھے جب کہ یہودی جو 56 ہزار سے زیادہ نہ تھے وہ صرف 3 فیصد اراضی کے مالک تھے دنیا کے مختلف ممالک میں رہنے والے یہودیوں نے صیہونی تنظیم کی ترغیب پر فلسطین میں آباد ہونا شروع کر دیا۔

برطانوی ہائی کمشنر نے باہر سے آنے والے یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے' وہاں پر زمین خریدنے اور کاروبار کرنے کے لیے تمام ممکنہ سہولتیں فراہم کیں۔ 1919ء میں یہودیوں نے ''دیوار گریہ'' جسے ہیکل سلیمانی کا حصہ سمجھتے ہیں کی خریداری کے لیے عربوں کو 80 ہزار پونڈ کی پیشکش کی مگر عربوں نے اس سے صاف انکار کر دیا یہودی جس تیز رفتاری سے فلسطین میں آباد ہوئے اس کا اندازہ اس تخمینہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1922ء میں فلسطین کی مجموعی آبادی کا 12 فیصد 1931ء میں 17 فیصد اور 1944ء میں 31 فیصد سے زیادہ یہودی فلسطین میں آباد ہو گئے۔ تیس سالہ برطانوی قبضے کے دوران یہودی مشکل سے ساڑھے پانچ فیصد اراضی خریدنے میں کامیاب ہوئے جن کے مالک شام یا لبنان میں رہتے تھے فلسطینی عربوں نے بھاری قیمتوں کے باوجود اپنی اراضی فروخت نہ کی برطانوی ہائی کمشنر نے یہودیوں کو حکومتی نظم و نسق میں مساوی طور پر شریک کیا اس نے نہ صرف تعلیم وزراعت کے محکمے یہودیوں کے سپرد کر دیئے بلکہ بیرونی ملکوں سے یہودیوں کے داخلے اور قومیت کے معاملات بھی ان کے ہاتھ میں دے دیئے جس کے نتیجے میں ایسے قوانین معرض وجود میں آئے جن کے ذریعے باہر سے آنے والے یہودیوں کو فلسطین میں آ کر زمینیں خریدنے کے لیے سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔

20 نومبر 1947ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے امریکہ اور روس کی یہ تجویز منظور کرلی کہ فلسطین کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ساڑھے چار ہزار مربع میل کا علاقہ عربوں کو دے دیا جائے اور 5373 مربع میل کا علاقہ یہودیوں اور یروشلم اور اس کے گردونواح کا 489 مربع میل کا علاقہ اقوام متحدہ

کے سپرد کر دیا جائے اور یکم اگست 1948ء تک فلسطین پر سے برطانوی قبضہ ختم کر دیا جائے اس قرارداد میں جس طرح دو تہائی اکثریت حاصل کی گئی اس پر عربوں نے اعتراض کیا اور اس کو ناجائز تسلیم کرتے ہوئے اس کی پابندی سے آزاد ہونے کا فیصلہ کیا۔

اس دوران میں برطانوی فوجوں کی فلسطین سے واپسی شروع ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی یہودیوں اور عربوں کے درمیان مسلح تصادم شروع ہو گئے یہودیوں نے اپنے علاقے کی عرب اقلیت پر بے پناہ ظلم وستم توڑے جس کہ وجہ سے ان عربوں کو اپنا ملک چھوڑنا پڑا۔ وہاں سے ہجرت کرنے والے عربوں کی تعداد بہت کم عرصے میں دس لاکھ تک پہنچ گئی عرب پوری طرح مسلح یہودیوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور 15 مئی 1948ء تک اندرون فلسطین میں عربوں کی مزاحمت ختم ہو گئی 15 مئی کو برطانوی قبضے کے خاتمے کے فوراً بعد یہودیوں نے تل ابیب میں اسرائیل کی نئی ریاست کا اعلان کر دیا فلسطینی عربوں کی طاقت چونکہ ختم ہو چکی تھی اس لیے 15 مئی کی صبح، مصر، اردن اور عراق کی فوجیں عربوں کے مفاد کے تحفظ کے لیے فلسطین میں داخل ہونا شروع ہو گئیں بعد میں سعودی فوج کا ایک دستہ بھی مصری فوج سے آن ملا لیکن عربوں کی اس متحدہ فوج کو بھی کوئی بڑی کامیابی نہ ہوئی شامی اور لبنان جو ایک سال قبل آزاد ہوئے تھے ان کے حملے بھی قطعی بے اثر رہے مصری فوج غزہ شہر اور اس سے متصل مختصر سے علاقے کے علاوہ کسی علاقے پر قبضہ نہیں کر سکی۔ اردن کے جدید ترتیب یافتہ عرب لیجن نے وسطی فلسطین کے بیشتر حصہ اور بیت المقدس (یروشلم) کے قدیم شہر کو یہودیوں کے قبضے میں جانے سے بچا لیا اسی دوران 11 جون 1948ء کو طرفین نے جنگ بندی کر دی اس کے بعد جنگ شروع اور ختم ہو گئی۔ یہاں تک کہ 1949ء میں عرب ملکوں کو اسرائیل کے وجود کو عملاً تسلیم کرنا پڑا۔ 11 مئی 1949ء اسرائیل اقوام متحدہ کا رکن بنا لیا گیا۔

1948ء میں جب اسرائیل ریاست قائم ہوئی تو اس کا رقبہ صرف پانچ ہزار تین سو مربع میل تھا اور اس کی حدود میں پانچ لاکھ یہودی اور پانچ ہزار عرب آباد تھے اب یہ رقبہ ساڑھے تینتیس ہزار مربع میل ہو گیا جو اصل فلسطین کے رقبے سے بھی دس ہزار میل زیادہ یعنی تین گنا زیادہ ہے۔

سقوط ڈھاکہ

ہر قوم میں جذبۂ آزادی پایا جاتا ہے مگر اسے اجاگر کرنے کے لیے ایک ولولہ انگیز قیادت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس قوم میں ایک مخلص لیڈر رہتا ہے۔ وہ تمام لوگوں کی مخلصی کو اجاگر کر کے اپنے مطالبات منوانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور جس قوم و ملک میں لیڈر شپ کی کمی ہو وہ "بے حس" اور "محکوم" ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جس کی واضح مثال 1947ء اور دسمبر 1971ء ہے۔ 1947ء میں ہمارے پاس قائداعظم محمد علی جناح ؒ کی صورت میں ایک ولولہ انگیز شخصیت موجود تھی اور ہم نے ناممکن کو بھی ممکن بنا ڈالا اور ایک علیحدہ ارض پاکستان کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ملک کے دونوں حصوں کو متحد رکھنے اور ایک متفقہ آئین کی تیاری کے مسئلے کے علاوہ اہل پاکستان کا نامساعد سماجی، اقتصادی اور انتظامی صورت حال سے بھی عہدہ برآ ہونا تھا۔ مگر اس کے باوجود اعلیٰ لیڈر شپ کی وجہ سے ہم نے کچھ عرصہ ان مسائل کو اپنے قابو میں رکھا۔ مگر بدقسمتی سے قائداعظم ؒ اور لیاقت علی خان کی زندگیوں نے ان سے وفا نہ کی اور دونوں عظیم اور مخلص رہنما قیام پاکستان کے تھوڑے سے عرصے بعد ہی اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے اور ان دونوں کے جانشین ان خوبیوں سے محروم تھے جو ان دونوں لیڈروں میں پائی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ مسلم لیگ جو قیام پاکستان کے وقت مسلمانوں کی واحد رہنما نمائندہ تنظیم تھی اور جس کی جڑیں عوام میں بہت مضبوط تھیں اپنے اصل مقاصد سے ہٹ گئی۔ یہ جماعت آزادی کے بعد لوگوں کو یکجا رکھنے میں بری طرح ناکام ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے لوگ اس پلیٹ فارم سے ہٹنا شروع ہو گئے۔ جس کا نتیجہ بغاوت کی شکل میں نکلا اور اسی جماعت کے رہنماؤں نے اپنی علیحدہ جماعتیں بنالیں۔

اگر ہم قیام پاکستان کے وقت حالات پر نظر دوڑائیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ بے شک اس خطے میں دو بڑی قوموں کو آزادی حاصل ہوئی۔ یعنی ہندو اور مسلمانوں کو، مگر آزادی کے وقت دونوں کے جذبات

میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ایک طرف مسلمان خوشی کے مارے جھوم رہے تھے تو دوسری طرف ہندوؤں میں ماتم کا سماں تھا۔ ایک طرف مسلمان اپنی جدوجہد آزادی میں کامیابی پر جشن منا رہے تھے تو دوسری طرف ہندوؤں میں اپنی اس ناکامی پر سوگ منایا جا رہا تھا۔ کیونکہ ہندوؤں کی یہی کوشش رہی تھی کہ ہندوستان تقسیم نہ ہو اور اس سارے خطے پر صرف ان کی حکمرانی ہو اور مسلمان محکوم قوم کے طور پر ان کے زیر سایہ رہیں۔ آزادی سے چند دن پہلے مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ "پاکستان میری لاش پر بنے گا" مگر خدا کو منظور تھا اور یہ ملک معرض وجود میں آ گیا۔ ہندوؤں نے پہلے دن سے ہی اس ملک کو دل سے قبول نہ کیا اور ہمیشہ اس کے ٹکڑے کرنے کی کوششوں میں مصروف رہے۔

اس سلسلے میں انہوں نے بنگلہ دیش کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ کیونکہ ایک تو وہاں ہندو بھاری تعداد میں تھے دوسرا بنگالیوں میں ہندو کلچر کو فروغ حاصل تھا۔ لیکن ان تمام وجوہات سے ہٹ کر ہندوؤں کو بنگالیوں پر مکمل کنٹرول حاصل تھا۔ تقسیم ہند کے بعد مغربی پاکستان سے تو تقریباً تمام ہندو چلے گئے مگر مشرقی پاکستان میں ایسا نہ ہوا۔ ہندوؤں نے اپنے بیوی بچوں کو مغربی بنگال یا کلکتہ بھیج دیا مگر خود مشرقی پاکستان میں ہی رہے۔ ہندو جو کچھ مشرقی پاکستان سے کماتے وہ بھارت بھیج دیتے۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان سے بھاری تعداد میں چیزیں سمگل ہو کر بھارت جانے لگیں اور بھارت سے پاکستان دشمن لٹریچر یہاں آنے لگا۔ اس لٹریچر کی تقسیم ہندوؤں کے لیے کوئی بڑی مشکل نہ تھی کیونکہ وہاں کے تعلیمی اداروں پر بھی ہندوؤں کا قبضہ تھا، جس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں کے 1290 ہائی سکولوں اور ۴۷ کالجوں کے 95 فیصد پر ہندو لابی کا کنٹرول تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ہندو اساتذہ نے بنگالی نوجوانوں کو مغربی پاکستان کے خلاف بھڑکانے میں اہم کردار ادا کیا۔ طلبہ کے لیے جو کتب منتخب کی جاتی ان میں "نظریہ پاکستان" کے خلاف مواد ہوتا تھا۔ اسی طرح ان استادوں اور پروفیسروں نے ان نوجوان بنگالیوں کے ذہن میں یہ بات بھی ڈال دی کہ تعداد میں زیادہ ہونے کے باوجود تم لوگوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے اور بنگلہ کی بجائے اردو کو تمہاری قومی زبان قرار دیا گیا ہے جو کہ تمہاری اپنی کمزوریوں کا نتیجہ ہے جو تم لوگ ان کے غلاموں کی طرح ان کی ہر بات مان لیتے ہو۔ اس کے بعد بنگالی نوجوانوں نے قیام پاکستان کے فوراً بعد بنگلہ کو سرکاری زبان قرار دینے کے حق میں مظاہرے کئے اور بنگلہ کو مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان اور صوبے میں تمام سطحوں پر ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے زور دیا۔ ان مظاہروں میں شدت فروری 1952ء میں تب آئی جب خواجہ ناظم الدین نے جو اس وقت کے وزیراعظم تھے، نے ڈھاکہ

میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو پاکستان کی واحد سرکاری زبان ہوگی۔ اس مسئلے نے تحریک کی شکل اختیار کر لی اور صوبے اور مرکز میں تصادم ناگزیر ہو گیا۔ صوبائی اسمبلی میں حکومت اور اپوزیشن نے مشترکہ طور پر بنگلہ کو مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان قرار دینے کی منظوری دی مگر وفاق نے بلا وجہ اسے روکے رکھا۔ اگر اس مسئلے کو اسی وقت حل کر لیا جاتا تو شاید آج ہمیں بنگلہ دیش بننے کی شکل میں رسوائی نہ اٹھانی پڑتی۔ کیونکہ اس کے بعد بنگالیوں میں احساس محرومی بڑھتا گیا۔ بنگالیوں نے لسانی مسئلے پر فیصلے میں تاخیر کو مغربی پاکستان کی اقلیت کی طرف سے اکثریت پر اپنی مرضی تھوپنے کی کوشش قرار دیا۔ اس کے ردعمل کے طور پر بنگالیوں نے وسیع پیمانے پر ہڑتالوں اور احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ شروع کر دیا اور اسی دوران 12 فروری 1952ء کو ایک مظاہرے کے دوران پولیس کے ہاتھوں دو طالب علم ہلاک ہو گئے۔ جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ فوج طلب کرنا پڑ گئی۔ اس واقعہ نے قومی یکجہتی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ ان واقعات کے بعد مرکزی حکومت اپنا اعتماد کھو بیٹھی اور مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ کے خلاف نفرت کے جذبات نے جنم لیا۔

اس تباہی کے بعد ۱۹۵۴ء میں دستور ساز اسمبلی میں بنگالی کو ایک زبان کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ اور یوں اس تحریک کا خاتمہ ہوا۔ مگر اس مسئلے نے بنگالیوں کو احساس کمتری اور مغربی پاکستان سے نجات کی ترغیب دی جو آگے چل کر حقیقت کا روپ دھار گئی۔ اگر قومی رہنما زبان و ثقافت کے معاملے میں بنگالیوں پر جبر اور اصرار نہ کرتے تو وہاں بنگلہ قومیت کے حق میں جارحانہ ردعمل پیدا نہ ہوتا۔ دوسری طرف اگر ان کے یہ مطالبات شروع میں ہی مان لیے جاتے تو آگے چل کر وہاں علیحدگی کی تحریکیں جنم نہ لیتیں مگر حقیقی طور پر اگر ہم اس مسئلے کو دیکھیں تو اس کو ابھارنے میں ہندو اساتذہ کا کام ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی اور اس سے ملحقہ کالجوں کے لیے صوبے بھر کے سکولوں میں درس و تدریس کے کام پر مامور تھے۔ ان ہندو اساتذہ نے وہاں کے مسلمان طالب علموں کو نصابی تعلیم سے بہرہ مند کرنے کے بجائے ان کی اس طرح برین واشنگ کی کہ مشرقی پاکستان کے مسلمان نوجوانوں کی بڑی تعداد ہندوؤں کے دام فریب میں آ گئی۔

معاشی میدان میں بھی مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کے مقابلہ میں کافی پسماندہ تھا۔ یہ پسماندگی بے شک بنگالیوں کو ورثہ میں ملی تھی مگر اس کے علاوہ اس میں بنیادی کردار غلط منصوبہ بندی نے ادا کیا۔ مشرقی پاکستان کی ساری معیشت کلکتہ سے وابستہ تھی جو آزادی کے بعد ان سے علیحدہ ہو گیا اور ان کی

معاشی مشکلوں میں مزید اضافہ ہوگیا۔ کیونکہ مشرقی پاکستان کی بنیادی فصل پٹ سن تھی جس کی تیاری کے لیے تمام کارخانے اور برآمدی بندرگاہ کلکتہ میں واقع تھی۔ اس ناقص منصوبہ بندی کے تحت بنگالیوں کو اپنی برآمدات کے لیے چٹاگانگ جیسی غیر معیاری بندرگاہ پر انحصار کرنا پڑا۔ ان ساری مشکلات نے بنگالیوں کے ذہن میں حکومت مخالف بغاوت کو جنم دیا اور وہ یہ سوچنے لگے کہ مشرقی پاکستان کے زرمبادلہ سے آمدن کا 60 فیصد سے 80 فیصد تک کا حصہ ''پٹ سن'' کی آمد سے حاصل ہوتا ہے تاہم اس کی بڑی مقدار مغربی پاکستان پر خرچ ہوتی ہے۔ ان زیادتیوں کا اندازہ اس بات سے بھی بخوبی ہو جاتا ہے کہ 1947ء سے 1948ء اور 1959ء سے 1960ء کے دوران سرکاری شعبے میں مشرقی پاکستان میں 2750 ملین روپے خرچ کیے گئے جبکہ اس عرصے میں مغربی پاکستان میں ان اخراجات کا اندازہ 8017 ملین روپے تھا۔

مشرقی پاکستان کی معاشی پسماندگی میں بڑی حد تک مرکزی حکومت بھی شامل تھی جس نے یہاں کی بجائے مغربی پاکستان میں صنعتوں کے فروغ پر زیادہ توجہ دی۔ دوسرا پاکستان کے 83 فیصد سرمایہ کاروں کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا۔ بھارت سے مہاجروں کی بڑی تعداد مغربی پاکستان آئی، اس لیے ان کو روزگار فراہم کرنے کے لیے صنعتی ترقی ضروری تھی۔ دوسری طرف مشرقی پاکستان کی ساری سرمایہ کاری ہندو کر رہے تھے اور وہ اس سے حاصل ہونے والی تمام رقم بھارت بھیج دیتے تھے اور آبادی کے بڑھتے ہوئے رجحان نے بھی مشرقی پاکستان میں بے روزگاری میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ افلاس، بیماری اور بیروزگاری کی بڑھتی ہوئی آفات نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کو مغربی پاکستان سے علیحدہ ہونے پر مجبور کر دیا اور ان لوگوں کا ساتھ دینے کے لیے تیار کیا جو پہلے سے اس کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اگر ہم مشرقی پاکستان اور غیر ملکی دانشوروں کی کتابیں سقوط ڈھاکہ پر پڑھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ علیحدگی کا سب سے بڑا سبب ہی معاشی محرومیاں تھیں۔ جن کی ذمہ داریاں مغربی پاکستان پر عائد ہوتی تھیں۔ لیکن اس میں بھی سو فیصد حقیقت نہ تھی بلکہ ہندوؤں نے اس میں بہت بڑا کردار ادا کیا اور موثر پروپیگنڈہ کے ذریعے تمام ذمہ داری مغربی پاکستان پر ڈال دی گئی۔ مشرقی پاکستان نے آزادی کے بعد یہ توقعات پیدا کر لی تھیں کہ ان کی معاشی بدحالی اب زیادہ دیر نہیں رہے گی اور اب معاشی طور پر یہ مضبوط ہو جائیں گے مگر اس طرح ہونا ممکن نہ تھا کیونکہ مشرقی پاکستان کی اسی فیصد قومی دولت آزادی کے وقت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی اور ان کی خوشحالی کا دارومدار ہندوؤں پر تھا۔ مگر وہ اس ساری دولت کو بھارت منتقل کر دیتے

جس سے مشرقی پاکستان میں مزید سرمایہ کاری رک گئی اور بیروزگاری میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ اکثر شہری علاقوں میں جائیداد اور عمارات کا پچاسی فیصد غیر مسلموں کی ملکیت تھا۔ مشرقی پاکستان کے تیرہ سو نجی ہائی اسکولوں اور پینتالیس نجی کالجوں میں سے 90 فیصد سے بھی زیادہ ہندوؤں کی ملکیت تھے جن کے کمروں میں سرعام قائداعظمؒ کی جگہ گاندھی کی تصویر آویزاں تھیں۔ مغربی اور مشرقی پاکستان میں صنعتی ترقی میں فرق اس بات سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ 1958ء میں پورے مشرقی پاکستان میں 148 کروڑ روپے کا صنعتی سرمایہ لگا ہوا تھا جبکہ یہ صرف کراچی میں 114 کروڑ سے زائد تھا۔ اور اس کے علاوہ 294 کروڑ مغربی پاکستان کے دوسرے شہروں میں تھا۔ یہ حقیقت آج بھی مانی جاتی ہے کہ مشرقی پاکستان میں صنعتی سرمایہ کاری، مغربی پاکستان کے مقابلے میں ایک چوتھائی تھی۔

اسکے علاوہ قومی بجٹ کا چھپن فیصد دفاع پر خرچ ہو رہا تھا۔ جسکے لیے ٹیکس مشرقی پاکستان سے بھی وصول کیا جا رہا تھا مگر اس دفاعی بجٹ کا صرف دس فیصد مشرقی پاکستان میں خرچ ہو رہا تھا۔ کیونکہ زیادہ تر چھاؤنیاں، فوجی تنصیبات، فوجی مراکز، فوجی افسر جوان مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے 1969ء تک مشرقی پاکستان کا فوج میں حصہ آٹھ فیصد سے زیادہ نہیں تھا اس کے علاوہ تمام بڑے ڈیم مغربی پاکستان میں تعمیر ہوتے رہے۔ اور مشرقی پاکستان سیلاب کی آفتوں سے تباہ و برباد ہوتا رہا۔ مغربی پاکستان کی مشرقی پاکستان کو برآمدات کی مالیت بعض اوقات دوگنا سے بھی زیادہ ہوتی' اس طرح وسائل مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان کی طرف منتقل ہوتے رہے۔ ایک اندازے کے مطابق بنگلہ دیش بننے کے بعد مشرقی پاکستان کے وسائل مغربی پاکستان کو منتقل ہوئے۔ اس کے علاوہ سالانہ 75 سے 80 کروڑ روپے کا زر مبادلہ ہندو سرمایہ کار بھارت منتقل کر دیتے، مشرقی اور مغربی بنگال کے درمیان آمدورفت پر کوئی خاص پابندی نہ ہونے کی وجہ سے اقلیت اپنی دولت بغیر کسی روک ٹوک کے مغربی بنگال منتقل کرتی رہی۔ اس طرح مشرقی پاکستان کے عوام اپنے حق کی خاطر لڑنے مرنے کو تیار ہو گئے کیونکہ جب بھوک ستاتی ہے تو مسلمان ہونے اور بھائی چارے سے رہنے کے تمام اصول بھول جاتے ہیں اور یہ بھوک اور زیادتیوں ہی کا نتیجہ تھا۔ پاکستان جغرافیائی لحاظ سے بھی ایک نہیں تھا بلکہ دو حصوں میں بٹا ہوا تھا جس کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ تھا اور دونوں کے درمیان دشمن کا علاقہ تھا۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کا بحری رابطہ طویل اور دشوار گزار تھا اور بھارت کے لئے کسی بھی وقت اس کی ناکہ بندی ناممکن نہ تھی۔ اسی خطرے کے پیش نظر قائداعظمؒ نے دونوں صوبوں کو ملانے کے لئے بھارت کے

درمیان سے گزرنے والے خشکی کے راستے کا مطالبہ کیا تھا جسے حکومت برطانیہ نے مسترد کر دیا، کیونکہ ان کا بھی منصوبہ تھا کہ یہ دو خطے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، آسانی سے نہ مل سکیں اور حالات کو بھانپتے ہوئے ہی لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قیام پاکستان کے وقت کہا تھا کہ ''میں دیکھ رہا ہوں کہ ان دونوں حصہ میں جدائی اگلے پچیس برس تک یقینی ہے'' اور ہوا بھی اسی کے مطابق۔ ویسے بھی ان دو ملکوں میں حدود جسے فرق تھا، مذہب اور مشترکہ جدوجہد آزادی کے سوا ان کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں تھی مثلاً ثقافت، زبان اور رسم و رواج وغیرہ۔ آسان لفظوں میں یہ کہنا چاہیے کہ ان دونوں حصوں میں کوئی ایسی چیز مشترک نہیں تھی جو ان دونوں کو متحد رکھ سکتی تھی۔

قیام پاکستان کے بعد جہاں دوسرے گھمبیر مسائل کا سامنا تھا وہاں ایک خطرناک مسئلہ صوبائیت کی شکل میں سامنے آیا اور ڈھاکہ جو کہ مشرقی پاکستان کا دارالخلافہ تھا۔ وہاں مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان ایک گہری دشمنی پروان چڑھنے لگی۔ مشرقی پاکستان کے سیاستدانوں نے عوامی مقبولیت حاصل کرنے کی خاطر اس مسئلے کو خوب ہوا دی۔ اس ساری کارروائی سے ایک نعرہ نے جنم لیا کہ ''بنگال بنگالیوں کا ہے'' جس نے آگے چل کر صوبائیت اور نفرت کے بیج بوئے جس کے زہر سے پاکستان کی بنیادوں میں ایسی دراڑیں پڑ گئیں کہ بالآخر اس عمارت کو زمیں بوس ہونا پڑا۔ 1954ء کے الیکشن میں عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے عوامی لیگ نے لوگوں کو جذبات کی آگ میں دھکیل کر صوبائیت کا مسئلہ اٹھایا جو تھوڑے ہی عرصے میں ایک گھمبیر مسئلہ بن گیا۔ عوامی لیگ چونکہ ایک علاقائی جماعت تھی، اس لئے وہ جھوٹی مقبولیت کے لیے لوگوں کے مسائل کو اپنی ہمدردی کی طرف موڑ رہے تھے۔ جبکہ حقیقت میں اس کو بنگالی عوام کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ وہ تو سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے یہ سب کچھ کر رہے تھے۔

ان تمام عوامل کے علاوہ آئین سازی اور علاقائی خودمختاری کے مطالبے سے متعلق اختلافات اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال نے بھی مشرقی پاکستان میں سیاسی انتشار اور صوبہ پرستی کے رجحانات کو ہوا دی۔ ان اختلافات نے صوبوں کے درمیان سیاسی منافقت اور بدگمانیوں میں اضافہ کیا ملک کے اس غیر صحت مندانہ سیاسی ماحول نے آئین سازی کے نازک اور مشکل مرحلے کو مزید دشوار بنا دیا۔ اس صورتحال نے بڑی خطرناک شکل اختیار کر لی اور کوئی بڑا لیڈر نہ ہونے کی وجہ سے ان مسائل کو قابو میں نہ کیا جا سکا اس طرح ان تمام مسائل نے مل کر مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان نفرت کے

جذبات کو اس قدر بڑھا دیا کہ جن کو سنبھالا دینا ممکن نہ رہا۔

مغربی پاکستان کے مسلمانوں کا کوئی تعلق مشرقی پاکستان کے مسلمانوں سے نہیں رہا تھا۔ سرکاری عہدیداران کے لیے اجنبی تھے، ان حالات میں ہندو اساتذہ، وکلا اور سیاسی مفاد پرستوں کو اپنا دائرہ اثر وسیع کرنے میں بڑی آسانی ہوگئی۔ مغربی پاکستان والے اردو کا ذکر بہت کرتے تھے مگر بولتے صرف انگریزی تھے۔ جب مغربی پاکستان سے زبان کا رابطہ بھی پیدا نہ ہوسکا تو مشرقی بنگال کے ہندوؤں کو بنگالی مسلمانوں سے لسانی تعلق بڑھا کر ایک بنیادی کلچرل مماثلت اور اشتراک کی شکل دینے کا موقع مل گیا۔ ایک اسلام کا رشتہ بچا تھا مگر اسے بھی ختم کر دیا گیا۔ کیونکہ مسائل کی آگ میں جل کر بنگالی اسلامی بھائی چارے کے سبق کو بھی بھول چکے تھے جب زندگی کے کسی شعبے میں کسی اسلامی قدر کا کوئی نشان نہ تھا تو دلوں میں اس کی جھلک کیونکر آتی، وہی کچہریاں لگتی تھیں، جھوٹی شہادتیں، وہی جبر و استعداد کے طریقے، وہی انگریزی طرز کے الیکشن اور وہی ووٹوں کی دھاندلیاں، کسی کو بھی برابری کی سطح حاصل نہ تھی۔ غریبوں کی حق تلفی ہو رہی تھی۔ اسلام تو بس لفظوں کا ایک کھیل تھا۔

1965ء کی جنگ نے مشرقی پاکستان کے باسیوں کی سوچ پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ کیونکہ جنگ کے دوران بنگالیوں نے اپنے آپ کو بے یار و مددگار اور غیر محفوظ پایا۔ اس دوران مشرقی پاکستان میں صرف ایک ڈویژن فوج موجود تھی۔ جنگ کے دوران وہ مکمل طور پر بھارت کے رحم و کرم پر تھے۔ اس جنگ نے ان کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر جنگ طوالت اختیار کر جاتی تو ان کا بچنا محال تھا۔ اس مسئلے کو مزید بگاڑنے میں اس وقت کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کے بیان نے اور مدد دی جس میں انہوں نے کہا کہ مشرقی پاکستان کو چین نے بچایا ہے۔ اس بیان نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کہ اگر جنگ کے دوران میں مشرقی پاکستان کی حفاظت کا سہرا پاکستانی فوج کی بجائے چین کی بھارت سے اتفاقیہ دشمنی ہے تو اس میں پاکستان کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس جنگ کے دوران میں مشرقی پاکستان کے دفاع سے متعلق ابھرنے والے سوالات نے خود مختاری کی تحریک کو مزید تقویت بخشی، اس طرح عوامی لیگ کو یہ موقف اختیار کرنے کا سنہری موقع مل گیا کہ ''مشرقی پاکستان اس وقت تک بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہوسکتا، جب تک وہ اپنے معاملات میں خود مختار اور اپنے وسائل کا خود مالک نہیں بن جاتا۔'' اس جنگ نے صوبائی خود مختاری کے رجحان کو اور طاقت بخشی۔

اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنا چھ نکاتی فارمولا پیش کیا جو ایک دھماکہ خیز

پروگرام پر مشتمل تھا۔ 1966ء میں اپنے دورہ مشرقی پاکستان میں صدر ایوب خان نے اس فارمولا کی مذمت کی اور ''خود مختاری کی آڑ میں علیحدگی کا پروگرام قرار دیا'' انہوں نے واضح الفاظ میں کہا ''اگر حالات نے مجبور کر دیا تو پاکستان کو اپنی وحدت برقرار رکھنے کے لیے خانہ جنگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

بھارتی حکومت اس دوران ان تمام معاملات کا بغور جائزہ لیتی رہی اور علیحدگی پسند کی تحریک کو کھلم کھلا حمایت اور تعاون کرتی رہی۔ اسی عرصے میں شیخ مجیب الرحمٰن نے بھارتی ڈپٹی ہائی کمشنر سے رابطہ رکھا۔ آل انڈیا ریڈیو سے شیخ مجیب کی سرگرمیوں اور چھ نکات کی تشہیر کیلئے ایک خصوصی پروگرام شروع کیا گیا۔ اس پروگرام کے ذریعے مغربی پاکستان کے خلاف نفرت پھیلانا اور بنگالیوں کو علیحدگی پسندوں کیساتھ شامل ہونے پر اکساتا تھا۔ اس سلسلے میں بھارت نے شیخ مجیب کو ایک ہیرو کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا۔

مجیب الرحمٰن کے چھ نکاتی فارمولے نے عوامی لیگ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا کیونکہ ان کے مغربی پاکستان کے ساتھیوں نے جن میں نوابزادہ نصر اللہ خاں بھی شامل تھے چھ نکات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس طرح نوابزادہ نصر اللہ نے مجیب الرحمٰن سے علیحدگی اختیار کر کے ایک علیحدہ جماعت بنالی۔ چنانچہ مجیب کی عوامی لیگ مغربی پاکستان میں اپنا وجود کھو بیٹھی اور یوں دونوں صوبوں کے درمیان سیاسی روابط اور کمزور ہو گئے اس طرح قومی یکجہتی کو مزید نقصان پہنچا۔

اس کے علاوہ مشرقی پاکستان کی تمام بڑی جماعتوں اور رہنماؤں نے چھ نکاتی فارمولا کو مسترد کر دیا اور اس بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ فارمولا ملکی سالمیت کے لیے تباہی کا موجب ہوگا۔ مگر ایوب خان نے ان رہنماؤں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش نہ کی بلکہ ان کے اس خیال کو مسترد کر دیا یوں انہیں صوبائی خود مختاری کے مسئلہ پر انتہا پسندانہ موقف اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

ان تمام عوامل سے ہٹ آج بھی جس چیز کو اس سانحہ کا موجب سمجھا جاتا ہے وہ سیاسی ہے۔ آزادی کے بعد لوگوں کے مختلف نظریات سامنے آئے۔ اس وقت مسلم لیگ کے سوا تمام جماعتیں علاقائی حیثیت کی حامل تھیں۔ ان جماعتوں میں سہروردی اور مولانا بھاشانی کی عوامی لیگ اور فضل حق کی کرشک سرامک پارٹی کو نمایاں حیثیت تھی۔ دوسری تمام جماعتوں کی نسبت عوامی لیگ نے بہت جلد عوام میں مقبولیت حاصل کر لی۔ اس کے علاوہ اس جماعت کی قیادت نے قیام پاکستان کے دوران فعال کردار ادا کیا تھا۔ بنگالی کو ملک کی سرکاری زبان بنانے کی مہم کو کامیابی سے ہمکنار کرانے کا سہرا اسی جماعت کو جاتا

تھا۔عوامی لیگ ایک ترقی پسند جماعت کے طور پر متعارف تھی جبکہ مسلم لیگ کو مغربی پاکستان کے مفادات کا پاسدار سمجھا جانے لگا۔عوامی لیگ کا بنگالیوں سے وعدہ تھا کہ وہ مغربی پاکستان کے شکنجے سے آزادی حاصل کر کے دم لیں گے۔عوامی لیگ کو سیکولر پارٹی کی حیثیت حاصل تھی اس لیے غیر مسلموں خصوصاً ہندوؤں کا اس جماعت میں بڑا عمل دخل تھا۔ان عوامل کی بنا پر عوامی لیگ طالب علموں اور بائیں بازو کے عناصر کی ہردلعزیز سیاسی جماعت بن گئی اور یہی طبقے مشرقی پاکستان کی سیاست کی روح رواں کی حیثیت رکھتے تھے۔1954ء میں مشرقی پاکستان میں عام انتخابات منعقد ہوئے۔عوامی لیگ نے دوسرے جماعتوں کیساتھ مل کر یونائیٹڈ فرنٹ کے پلیٹ فارم سے 21 نکات پر مبنی ''منشور آزادی'' کا اعلان کیا اور اسی دعوے پر انتخابات میں حصہ لیا۔انتخابات کے دوران یونائیٹڈ فرنٹ نے علاقائیت کا پرچار کیا اور مغربی پاکستان کے خلاف نفرت کو ہوا دی۔دوسری طرف مسلم لیگ اپنی ساکھ کھو چکی تھی اور وہ اس پروپیگنڈے کا مقابلہ نہ کرسکی۔اوراس کے نتیجے میں مسلم لیگ جو کبھی مسلمانوں کی واحد سیاسی نمائندہ جماعت تھی کو عبرتناک شکست ہوئی اور وہ 309 میں سے صرف 9 نشستیں حاصل کرسکی۔اس کے بعد نئی آنے والی قیادت کا نقطہ نظر غیر معمولی طور پر متعصبانہ اور علاقائی رجحانات کا حامل تھا۔یونائیٹڈ فرنٹ میں قومی نقطہ نظر کی حامل قیادت کا فقدان تھا جو ملکی یکجہتی کے لیے غیر معمولی طور پر مضر ثابت ہوا اور یوں پاکستان کی سیاست صوبہ پرستی کا شکار ہوگئی۔ان انتخابات کے بعد پورے علاقے میں فسادات کی مہر دوڑ گئی اس جماعت نے پہلے ہی علاقیت کو ہوا دی جسے اکثر مقامات پر بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے درمیان خونریز تصادم ہوئے اور اس طرح بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے درمیان خلیج بڑھتی گئی اسی دوران یونائیٹڈ فرنٹ کی حکومت کو اس بنا پر برطرف کر دیا گیا کہ وہ ''ملک کی یکجہتی کے خلاف سرگرم عمل تھی'' اسی دوران بنگالی وزیر اعظم محمد علی بوگرہ نے فضل حق کو غدار قرار دیتے ہوئے الزام عائد کیا کہ وہ ''مشرقی پاکستان کی علیحدگی کیلئے سازشوں میں مصروف تھے۔'' اس کے بعد گورنر راج نافذ کر دیا گیا جو کہ حالات کا تقاضہ تھا مگر بنگالی قوم پرستوں نے اسے مرکز اور مغربی پاکستان کے خلاف نفرت پھیلانے کیلئے استعمال کیا۔ انہوں بنگالیوں کو بھڑکانا شروع کر دیا کہ مشرقی پاکستان کی جمہوری حکومت کی برطرفی دراصل مرکز کی جس پر مغربی پاکستان کی افسر شاہی اور سیاستدانوں کا غلبہ تھا، گہری سازش کا نتیجہ ہے۔

ستمبر 1956ء میں سہروردی مرکز میں حکومت بنانے میں کامیاب ہوگئے، مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے پارلیمانی راہنما عطاالرحمٰن نے وزارت اعلیٰ کا منصب سنبھالا جس نے مرکز اور مشرقی پاکستانی

کے عوام کو وقتی طور پر یہ احساس دلایا کہ انہیں نظر انداز نہیں کیا جارہا۔ سہروردی کے ہی دور حکومت میں اپریل 1957ء میں مشرقی پاکستان کی اسمبلی نے ایک قرارداد منظور کرنے کا مطالبہ کیا جس میں کرنسی دفاع اور امور خارجہ کے سوا تمام محکمے صوبوں کی تحویل میں رہنے کا مطالبہ کیا گیا۔

اسی مسئلے پر سہروردی نے اپنی جماعت کو پیچھے ہٹنے کو کہا تو مجیب الرحمٰن سمیت ان کے ساتھیوں نے ان کی تائید سے انکار کر دیا۔ آخر کار مرکزی حکومت نے سہروردی کو اختیار دیا کہ وہ مشرقی پاکستان کے لیے خود مختاری کے تعین کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دیں۔ یہ کمیٹی کبھی وجود میں نہ آسکی اور خود مختاری کا مسلہ مزید گھمبیر ہوتا گیا۔ 1957ء میں جب سہروردی نے اپنی برطرفی کا خطرہ محسوس کیا تو انہوں نے مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا۔

ایوب خان نے 1958ء میں مارشل لاء نافذ کیا تو سیاسی حلقوں نے اسے مشرقی پاکستان کے خلاف مغربی پاکستان کی سازش قرار دیا۔ ان حلقوں کا موقف تھا کہ اگر جمہوری عمل منقطع نہ ہوتا تو ملک کی اقتصادیات اور انتظامیہ پر مغربی پاکستان کے جاگیرداروں کی گرفت ختم ہو جاتی اور بالاخر بنگالی اپنا حق حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ مگر مارشل لاء کے نفاذ سے عام انتخابات جن کے نتیجہ میں بنگالی اپنا حق نمائندگی حاصل کر سکتے تھے، وہ تمام امکانات ختم ہو کر رہ گئے۔ بنگالیوں کے مطابق مارشل لاء کا نفاذ بنگالیوں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور ان میں آنے والے سیاسی شعور کی وجہ سے کیا گیا تھا اور اس کی مکمل منصوبہ بندی مغربی پاکستانی اور غیر بنگالی نے کی ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ فوج مارشل لاء کے نفاذ سے پہلے بھی ایک طویل عرصہ سے، نوکر شاہی کے ساتھ مل کر ملک کے سیاہ وسفید پر قابض طبقے کے ایک خاموش حصہ دار کا کردار ادا کر رہی تھی۔ چنانچہ بنگالی سیاستدانوں کی رخصتی نے ان کی سیاسی محرومی میں مزید اضافہ کیا۔ دوسری طرف ایوب خان کی طاقت کا سرچشمہ فوج، نوکر شاہی اور جاگیردار طبقہ تھا۔ اس کے مقابلے میں مشرقی پاکستان کی ان تینوں طبقوں میں بہت کم نمائندگی تھی۔

ایوب خان نے دونوں صوبوں پر یکساں سختی سے حکمرانی کی مغربی پاکستانی میں انہوں نے ایک سخت گیر اور جابر جاگیردار نواب آف کالاباغ اور مشرقی پاکستان میں ریٹائرڈ انسپکٹر جنرل آف پولیس ذاکر حسین کو بطور گورنر تعینات کر دیا گیا۔ جس کے نتائج انتہائی بھیانک اور خطرناک نکلے۔ ذاکر حسین نے گورنر ہونے کے باوجود اپنا مخصوص پولیس والا رویہ جاری رکھا جس سے بنگالیوں میں غلامی کا احساس بڑھنے لگا۔ انہوں نے ممتاز سیاسی رہنماؤں پر پولیس تشدد کروادیا۔

دوسری طرف ایوب خان کو بنگالیوں کے جذبات کا بخوبی علم تھا اور وہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے تھے کہ اگر صورت حال کو کنٹرول میں نہ لایا گیا تو قومی یکجہتی کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کر جائے گا۔ اس مقصد کے حصول کیلئے انہوں نے دونوں صوبوں میں قومی یکجہتی کی کونسلیں قائم کیں، بین الصوبائی وظائف کا اجراء کیا افسروں کے بین الصوبائی تبادلوں کے احکامات جاری کئے یہ مسئلہ ایوب خان کی نظر میں اتنا اہم تھا کہ 1962ء کے آئین میں علاقائی تضاد دور کرنے کے لیے خصوصی تبدیلی کی گئی تھی۔ تیسرے پنجسالہ منصوبے میں ایوب خان نے مشرقی پاکستان کے لیے 16 سو کروڑ روپے اور مغربی پاکستان کے لئے 14 سو کروڑ روپے مختص کئے ایک اندازے کے مطابق ان ترقیاتی اخراجات کے نتیجے میں مشرقی پاکستان کی علاقائی آمدنی میں 40 اور مغربی میں 35 فیصد کا اضافہ متوقع تھا ان تمام مسائل کے علاوہ ملازمتوں کا مسئلہ بھی بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ آزادی کے بعد بیشک اس میں بہتری آئی تھی لیکن بنگالی اس رفتار سے مطمئن نہ تھے۔ چنانچہ اس مسئلے کے حل کے لیے کوٹہ سسٹم متعارف کروایا گیا اور 20 فیصد میرٹ نشستوں کے علاوہ مشرقی پاکستان کے لئے 40 فیصد نشستیں محفوظ کر دی گئیں۔ 1941ء میں پاکستان کا انتخاب کرنے والے انڈین سول سروس کے 83 افسروں میں سے صرف ایک بنگالی تھا۔

دوسرے محکموں میں 1969ء تک یہ تعداد کافی حد تک بڑھ گئی۔ جن میں وزارت خارجہ کے 177 افسروں میں 73 یونین سروس کے 210 میں 94 اور فنانس سروسز کے 606 میں 208 افسر مشرقی پاکستان تھے۔ مگر مشرقی پاکستان کے سیاستدانوں نے اس کے باوجود عوام کے دلوں میں مغربی پاکستان کے خلاف جذبات ابھارے اوران تمام سہولتوں کے باوجود بھی علیحدگی کی تحریک جاری رکھی جسے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس تحریک میں کوئی بیرونی طاقت سپورٹ کر رہی تھی۔

1947ء میں پاکستان کے بننے کے بعد مشرقی پاکستان سے افواج کا صرف ایک فیصد تھا۔ جس کی وجہ وہ قانون تھا جو انگریزوں نے بنایا تھا کہ بنگالی اچھے فوجی بننے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ایوب خان نے اپنے دور حکمرانی کے دوران جسمانی معیار میں کمی کر دی جس کے نتیجے میں 1947ء سے لیکر 1958ء تک فوج میں مشرقی پاکستانیوں کی تعداد میں 100 فیصد کا اضافہ ہوا۔ 1967ء میں یہ اضافہ بڑھ کر 500 فیصد تک پہنچ گیا۔

اس دوران 1965ء کی جنگ نے مجیب کو مغربی پاکستان اور مرکزی حکومت کے خلاف بولنے کا شاندار موقع فراہم کر دیا۔ وہ علیحدگی پسند بھارتی ایجنٹ کہلانے پر فخر محسوس کرنے لگا اور حکومت نے اس

کی چالوں کی طرف زیادہ توجہ نہ دی جس سے اس کو عام لوگوں میں بے پناہ مقبولیت حاصل کرنے کا موقع ملا اور وہ علیحدہ خطے کی آواز بغیر کسی خوف وخطر کے بلند کرنے لگا۔ اس دوران مجیب الرحمٰن کی تحریک زوروں پر تھی کہ اپریل 1966ء میں اسے گرفتار کرلیا گیا تاہم وہ چند روز بعد رہا ہو گیا۔ رہائی کے بعد اس نے سارے صوبے کا دورہ کیا جس میں اس نے حکومت کے خلاف کھلے الفاظ میں بغاوت کا اعلان کیا۔ اس وقت تک مجیب الرحمٰن کا بنگالی قومیت کا نعرہ عام بنگالیوں میں مشہور ہو چکا تھا اور ملکی سالمیت کے لیے سنگین خطرہ بن چکا تھا۔ اسی دوران ملک میں مختلف مقامات پر فسادات ہوئے جن میں بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کا نقصان ہوا۔ ایک انٹرویو کے دوران مجیب الرحمٰن نے بڑے واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ "میں کسی کی نوآبادی کے طور پر مزید زندہ نہیں رہنا چاہتا...... ہماری حکومت کشمیر میں ریفرنڈم کیلئے برسرپیکار ہے، اسے چاہیے کہ وہ مشرقی پاکستان میں چھ نکات پر ریفرنڈم کرائے۔ دنیا دیکھے کہ 85 فیصد عوام میرے ساتھ ہیں۔"

مئی 1966ء میں مجیب الرحمٰن کو دوبارہ گرفتار کرلیا گیا جس کے بعد اس کے کارکنوں نے اپنے اس لیڈر کی تحریک کو اور زور وشور سے جاری رکھا اور مجیب الرحمٰن کی رہائی کے لیے جون 1966ء کو عام ہڑتال کی جو عوامی لیگ کی اپنی سوچوں سے بھی بڑھ کر کامیاب ہوئی۔ مجیب کے حامیوں نے سرکاری دفاتر میں توڑ پھوڑ کی۔ انہوں نے صوبائیت پسندی کی انتہا تب کی جب بنگالی کے سوا دوسری زبانوں کے سائن بورڈ والی دکانوں اور کاروں کو آگ لگادی۔ دوسری طرف ملکی اور غیر ملکی میڈیا نے بھی اس کی بھرپور پذیرائی کی۔ اس تمام کارروائی کے پیچھے بھارت کا ہاتھ تھا۔

اس نازک دور میں بھارتی ایجنسیوں کے لوگ سرحد پار کر کے مشرقی پاکستان میں داخل ہوتے اور تخریب کاری کے بعد بڑی آسانی سے فرار ہو جاتے بنگالیوں کو ان تخریب کاروں نے مغربی پاکستان اور مرکز کے خلاف خوب بھڑکایا اور ان کو بغاوت کیلئے مکمل تعاون کا یقین دلایا گیا۔ اس کے علاوہ مجیب نے بھی اس بات کو یقینی قرار دیا کہ امریکہ ہماری آزادی کے لئے ہماری خوب مدد کرے گا۔

اس کے بعد حالات نے تب پانسہ پلٹا جب جنوری 1968 میں اگرتلہ سازش کیس پہلی مرتبہ سرکاری طور پر منظر عام پر آیا اور اس کی سماعت کے لیے جسٹس اے رحمٰن کی سربراہی میں ایک ٹریبونل قائم کیا گیا۔ اس سازش کیس نے پاکستان کے دونوں حصوں کے علاوہ پوری دنیا کو حیرت زدہ کر دیا، کیونکہ اس میں ملوث 35 ملزموں میں بحریہ کے اراکین، سی ایس پی افسر اور عوامی لیگ کے کارکن شامل تھے۔

اس سازش میں ملوث ملزموں کی مشرقی پاکستان کے اخبارات اور عوام نے بھی خوب مذمت کی اور انہیں سخت سے سخت سزا دینے کی اپیل کی مگر کیس میں اچانک تبدیلی تب آئی جب کیس کے 15 روز بعد مجیب الرحمٰن کو بھی اس کیس میں ملوث کیا گیا۔ اس کے خلاف مشرقی پاکستان کی عوام نے خوب مظاہرے کیئے اور ان کو بغیر کسی وجہ سے اس کیس میں ملوث کرنے پر اس کو الٹا رنگ یہ دیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ بنگالیوں کے لیڈر کے خلاف مغربی پاکستان کی سوچی سمجھی سازش ہے۔ کیونکہ اس وقت مجیب الرحمٰن جیل میں تھے اور بظاہر ان کا کسی سازش میں ملوث ہونا ناممکن تھا۔ دوسرا ان کے خلاف سرکاری طور پر کوئی ٹھوس ثبوت مہیا نہ کیا گیا جس کی وجہ سے بنگالی اور مشتعل ہو گئے۔

مشرقی پاکستان کے عوام نے مطالبہ کیا کہ مقدمے کی سماعت کھلی عدالت میں کی جائے، دوسری طرف عوامی لیگ نے مجیب الرحمٰن کو اس سازش میں ملوث کرنے پر طلباء اور اپنے دوسرے حمایتیوں کو مشتعل کرنا شروع کر دیا مگر وہ اس میں بری طرح ناکام ہوئی۔ اس وقت حالات بالکل مختلف تھے اور حکومت کے پاس یہ سنہری موقع تھا کہ وہ علیحدگی پسندوں کے خلاف کوئی موثر اقدام کرتی کیونکہ عوام کی حمایت بھی حکومت کیساتھ تھی مگر انہوں نے اس موقع کو ضائع کر کے ''سقوط ڈھاکہ'' کی راہ ہموار کی۔ مجیب الرحمٰن بھی اپنی مقبولیت کھو چکا تھا۔ لیکن اس کیس کو نہایت ہی غیر دانشمندانہ طریقے سے چلایا گیا جس کی وجہ سے وہ ملزم اقوام کے ہیرو بن گئے۔ پولیس کے بے رحمانہ تشدد نے مجرموں کو مظلوم بنا دیا۔ اس کیس کی طوالت نے بھی حالات کو یک سر بدل دیا۔ اور بنگالی عوام کا حکومت مخالف ردعمل دیکھنے میں آیا۔ اس کیس کا سب سے بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ علیحدگی پر کھلم کھلا بحث ہونے لگی۔ اگر ایوب حکومت اس کیس پر مکمل توجہ دیتی تو مجیب الرحمٰن پر لگے الزام ثابت ہو جاتے تو مجیب کی مقبولیت عوامی حلقوں میں ختم ہو جاتی مگر اس کیس نے اسے بنگالی عوام میں مزید شہرت دی۔ ان سارے اقدامات کی وجہ سے یہ کیس واپس لینا پڑا۔ یہ کیس بھی ملکی سالمیت کیلئے مہلک ثابت ہوا، اور اس نے علیحدگی پسندوں کی مزید حوصلہ افزائی کی۔ ایوب کے دور میں کافی عرصہ تک سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد رہی اور پابندیاں اٹھ جانے کے بعد بھی ان جماعتوں میں ملک وقوم کے تحفظ کا فقدان رہا اور ہر جماعت اپنے علاقے تک مخصوص ہو کر رہ گئی اور صوبائیت نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کے باوجود عوامی ردعمل ایوب خان کے خلاف تھا۔ وہ ان کی پالیسیوں سے اتفاق نہیں کرتے تھے، اس کے علاوہ ایوب خان کے خاندان پر ناجائز طور پر دولت اکٹھی کرنے کے الزام نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

ان تمام واقعات کے بعد مولانا بھاشانی نے بغیر کسی خوف کے تشدد کا پرچار کیا اور مطالبات نہ مانے جانے پر گھیراؤ اور جلاؤ کی تحریک چلانے کا اعلان کیا۔ظاہری طور پر ان مطالبات کے مانے جانے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی ہے جس کے بعد دسمبر 1968ء سے جنوری 1969 تک سارا مشرقی پاکستان ہڑتالوں، گرفتاریوں اور پرتشدد واقعات کی آماجگاہ بنا رہا۔اس کے نتیجے میں سینکڑوں معصوم لوگوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیا گیا۔کاروباری زندگی مفلوج ہو کر رہ گیا۔بنگالیوں اور عوامی لیگ کے کارکنوں کے علاوہ تمام لوگوں پر ظلم و تشدد کیا گیا، جو ایوب خان اور مغربی پاکستان کے خلاف بنگالیوں کا اظہار بغاوت اور نفرت تھی۔اس کے بعد دوراندیشوں نے واضح الفاظ میں کہنا شروع کر دیا کہ اب ملک دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا۔

ان ہنگاموں اور فسادات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان کے ازلی دشمن بھارت نے مشرقی پاکستان میں تخریب کاروں کی بڑی تعداد کو داخل کر دیا، جنہوں نے پورے مشرقی پاکستان کو دہشت زدہ کر دیا اور بنگالیوں پر تشدد کے دوران یہ تاثر دیتے کہ وہ مغربی پاکستان کی ایماء پر یہ سب کچھ کر رہے ہیں، جسے حالات میں مزید خرابی پیدا ہوئی اور نفرتوں کے سمندر میں اور گہرائی آتی گئی۔اس وقت تک بنگالی عوام میں بغاوت عروج پر تھی اور وہ ان تمام حالات سے دلبرداشتہ ہو کر آزادی کی جنگ سمجھ کر مغربی پاکستان کے خلاف کھڑے ہو گئے ان تمام حالات سے نمٹنے کے لئے ایوب خان نے 26 فروری اور اس کے بعد 10 مارچ 1969 کو سیاسی رہنماؤں کیساتھ گول میز کانفرنس کو۔اس کانفرنس میں حزب اختلاف نے ایوب خان سے چھ نکات پر اپنا رویہ نرم کرنے کو کہا جس پر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔جس کے بعد حالات میں مزید کشیدگی آ گئی۔اس کے علاوہ ایوب خان نے بتایا کہ ان حالات کے پیچھے بھارت کا ہاتھ ہے اور بیس ہزار مسلح تخریب کار مشرقی پاکستان میں داخل ہو چکے ہیں، ان کا مقصد لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کرنا ہے تاکہ ان حالات میں دونوں حصوں کو علیحدگی پر مجبور کیا جا سکے۔

اس کے علاوہ یحییٰ خان بھی ایوب خان کے گرد سازشوں کا جال بننا شروع کر چکے تھے۔انہوں نے ایوب خان کو ایوان صدر تک محدود کر دیا اور ان کو باہر کے حالات سے بے خبر رکھا۔اس مقصد کے لیے یحییٰ خان نے مجیب الرحمٰن اور بھٹو کو استعمال کیا جو پہلے سے ہی ایوب خان کے شدید دشمن تھے۔اس کے علاوہ یحییٰ نے ایوب کے خلاف مظاہرین کو یہ یقین دلایا تھا کہ ان کے اور ایوب خان کے درمیان فوج نہیں آئے گی۔

مختصر یہ کہ ان تمام حالات کو بھانپتے ہوئے ایوب خان نے 25 مارچ 1969ء کو استعفیٰ دے دیا اور اقتدار یحییٰ خان کے حوالے کر دیا، جبکہ آئین کے مطابق ان کو اقتدار اسپیکر قومی اسمبلی کے سپرد کرنا چاہیے تھا جو مقررہ مدت میں حکومت کے حوالے کر دیتے۔ انہوں نے اپنے الوداعی خطاب میں کہا:

''کہا جارہا ہے کہ ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے، مرکز کو کمزور اور بے یارو مددگار بنا دیا جائے۔ افواج پاکستان کو مکمل طور پر مفلوج کر دیا جائے اور مغربی پاکستان اپنی سیاسی پوزیشن سے دستبردار ہو جائے۔ میں بحیثیت صدر اپنے ملک کی تباہی میں فریق نہیں بن سکتا۔''

اگر ہم ان کے اس خطاب کا بغور جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ کافی دیر پہلے بن چکا تھا اور اس کے پیچھے کوئی بڑی طاقت تھی جو بھارت کے ذریعے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کروانے پر تلی ہوئی تھی۔

ایوب کے بعد یحییٰ خان کے مارشل لاء نے بنگالیوں کو اور اذیت بخشی اور ان کے ذہنوں میں اس بات کو مزید مضبوط کر دیا کہ مغربی پاکستان کے لوگ ان پر حکمرانی چاہتے ہیں اور ان کا حق ان کو بغیر بغاوت کے کبھی حاصل نہیں ہوگا۔ مگر دوسری طرف یحییٰ خان نے ان خیالات کو بھانپتے ہوئے عوام کو یقین دہانی کرائی کہ جمہوری عمل کے جاری ہوتے ہی فوج بیرکوں میں واپس لوٹ جائے گی۔ ایوب خان کے مقابلے میں یحییٰ خان کی حکومت خالص فوجی حکومت تھی۔ ایوب کے دور حکومت میں افسر شاہی اور سیاستدان صدر کے معتمدین میں شامل تھے جبکہ یحییٰ کی حکومت میں تو حاضر سروس جرنیلوں کو مرکزی وزارتوں اور صوبوں کی گورنری پر فائز کر دیا گیا۔ بنگالیوں نے اس حکومت کے خلاف کڑی تنقید کی اور اپنے جذبات کے فوری اظہار کے لیے اجتماعی جلوس نکالے۔ اس دوران مجیب الرحمٰن علیحدگی کے لیے سرگرم عمل رہا اور دوسری طرف بھٹو بھی عوام میں مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ اور دونوں کی نظریں اقتدار پر تھیں۔ مختصر یہ کہ یکم جنوری 1970ء کو سیاسی سرگرمیوں سے پابندی اٹھا کر سیاسی جماعتوں کو سال کے آخر تک انتخابات کی تیاریاں مکمل کرنے کو کہا گیا۔ اس کے تین ماہ بعد یعنی 30 مارچ کو یحییٰ خان نے لیگل فریم ورک آرڈر جاری کرنے کا اعلان کیا جس کے نمایاں نکات یہ تھے:

1۔ قومی اسمبلی 313 ارکان پر مشتمل ہوگی جس میں تیرہ نشستوں پر انتخابات بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہوں گے۔

2۔ تمام نشستوں پر انتخابات بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہونگے۔

3۔آئین مندرجہ ذیل اصولوں پر مشتمل ہوگا:

ا)پاکستان کا طرز حکومت وفاقی ہوگا۔اور یہ ایک اسلامی جمہوریہ ہوگا۔

ب)اسلامی نظریے کو تحفظ دیا جائے گا۔

ج)سربراہ مملکت لازمی طور پر مسلمان ہوگا۔

د)جمہوریت کے بنیادی اصولوں کی پاسداری کی ضمانت دی جائے گی۔

ہ)وفاقی اور صوبائی حکومتوں میں اختیارات تقسیم کرتے وقت صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیئے جائیں گے۔تاہم وفاقی حکومت کو وہ تمام اختیارات حاصل ہوں گے جو ملک کی آزادی اور علاقائی سالمیت کے تحفظ کیلئے ضروری ہیں۔

و)ملک کے دونوں حصوں کے درمیان ہر قسم کا نفاذ ایک متعین مدت میں ختم کر دیا جائے گا۔

4۔ 120 دنوں میں آئین تیار کیا جائے گا۔بصورت دیگر قومی اسمبلی کو ختم کر دیا جائے گا۔

5۔صدر کو قومی اسمبلی کے منظور شدہ آئین کی توثیق کرنے،اسے مسترد کرنے یا اس میں ترمیم کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

بیشتر سیاسی جماعتوں نے صدر سے علاقائی خودمختاری کے مسئلے کا حل نکالنے کا مطالبہ کیا اور کہا کہ اسے اسمبلی کے رحم وکرم پر نہ چھوڑ دیا جائے۔مگر یحییٰ خان نے یہ مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔کیونکہ وہ مجیب الرحمٰن کو اسکے انتخابی نعروں سے محروم نہیں کرنا چاہتے تھے۔

مجیب الرحمٰن نے اس دوران اپنے چھ نکاتی پروگرام کو عام عوام کی امنگوں کا ترجمان قرار دیا۔اس کے علاوہ انہوں نے اعلان کیا کہ وہ چھ نکاتی فارمولے پر مذاکرات کے لیے تیار ہے۔اور اس میں ترمیم کی گنجائش ہے۔اس کے علاوہ اسے عوام کے سامنے ان کی اقتصادی پسماندگی دور کرنے کے نسخے کے طور پر پیش کیا گیا۔مجیب نے یقین دہانی کرائی تھی کہ پروگرام کا مقصد مستحکم پاکستان کا قیام ہے۔اس لئے عوام اور دانشور چھ نکات میں پنہاں علیحدگی کے جراثیم نہ دیکھ سکے۔

مختصر یہ کہ بہت سے عوامل کو نظر انداز کرتے ہوئے جن سے ملک کے ٹوٹنے کا خطرہ تھا۔7 دسمبر 1970ء کو پروگرام کے مطابق ملک بھر میں انتخابات کرائے گئے۔یحییٰ کی فوجی حکومت کو ہر طرف سے داد ملی،اسے زیادہ آزادانہ منصفانہ الیکشن پاکستان کی تاریخ میں پہلے کبھی نہ ہوئے' شاید مشرقی پاکستان میں یہ بات کسی حد تک ٹھیک نہ تھی،عوامی لیگ نے انتخابی مہم میں تشدد اور لاقانونیت کی مہم چلا کر میدان

میں کوئی مد مقابل ہی نہیں رہنے دیا تھا۔ اسی وجہ سے مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کی سو فیصد تعداد پولنگ سٹیشنوں پر پہنچی اور ان سب نے منصوبے کے تحت عوامی لیگ کے حق میں ووٹ دیئے۔ حیران کن صورت حال الیکشن کے بعد مجیب الرحمٰن میں دیکھنے آئی۔ اب وہ ایک ماہ پہلے والا مجیب نہ تھا جس نے چھ نکات پر لچک دکھانے کا وعدہ کیا تھا۔ الیکشن میں ملک کی سب سے اکثریت میں ووٹ لینے والی جماعت کے اس لیڈر نے اب کھلے الفاظ میں اعلان کیا کہ چھ نکات اب مشرقی پاکستان کے عوام کی امانت ہیں۔ لہٰذا کسی ترمیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسمبلی کی کل 300 نشستوں، جن میں خواتین کی نشستیں شامل نہیں تھیں، عوامی لیگ نے 162 میں سے 160 نشستیں مشرقی پاکستان میں حاصل کیں، جو اس کی شاندار کامیابی تھی۔ دوسری طرف مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی نے 138 میں سے 81 نشستیں حاصل کیں۔

اس کے بعد مشرقی پاکستان کی انتظامیہ عوامی لیگ کے سامنے جھکتی چلی گئی، عوامی لیگ کے لیڈر مجیب الرحمٰن کا گورنر ہاؤس پر مکمل اثر ورسوخ قائم ہو گیا۔ 3 جنوری 1971ء کو مجیب الرحمٰن نے عوامی لیگ کے منتخب ارکان سے چھ نکات پر قائم رہنے کا حلف لیا۔ اسی ماہ بھٹو نے مجیب الرحمٰن سے ملاقات کی مگر کوئی پیشرفت نہیں ہو سکی۔ 13 فروری کو صدر یحییٰ خان نے اعلان کیا کہ اجلاس 3 مارچ 1971ء کو ڈھاکہ میں ہو گا۔ بھٹو نے اس کی مخالفت واضح الفاظ میں کی اور اعلان کیا کہ جو رکن اسمبلی مغربی پاکستان سے ڈھاکہ جائے گا اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ بھٹو کا انداز جارحانہ تھا، دوسری جانب عوامی لیگ نے اصرار کیا کہ چھ نکات سے ہٹ کر کوئی دستوری فارمولا قبول نہیں کیا جائے گا اسی دوران فوجی جرنیلوں نے بھٹو کی حمایت شروع کر دی اور حد تو یہ تھی کہ جنرل یحییٰ خود چل کر بھٹو سے ملاقات کے لیے لاڑکانہ جاتے تھے۔ جبکہ مجیب الرحمٰن کو صدر سے ملاقات کے لیے خود چل کر جانا پڑتا تھا جہاں اسے اتنا پروٹوکول بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ بھٹو یحییٰ اور دوسرے جرنیلوں میں یہ بات طے ہو چکی تھی کہ مجیب کے موقف بدلنے تک اسمبلی کا اجلاس نہیں بلایا جائے گا۔ ساری قوم اس آنکھ مچولی کے کھیل کو دیکھ رہی تھی جس کے آخر میں نقصان اسی قوم کا ہونا تھا کیونکہ دونوں لیڈر ملکی سالمیت کو خطرے میں ڈال کر بھی اقتدار کی کرسی تک پہنچنا چاہتے تھے۔

حالات میں کشیدگی تب آئی جب یحییٰ خان نے 3 مارچ کے اجلاس کو غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیا جسکے بعد ڈھاکہ میں اشتعال انگیزی پھیل گئی اور لوگ ڈنڈوں اور لوہے کی سلاخیں اٹھائے

بازاروں میں آ گئے ۔ کیونکہ اس اجلاس کے ملتوی کرنے کی وجوہات بالکل بھی عقلی نہ تھیں کہ بھارت کا جارحانہ رویہ اور پیپلز پارٹی کی طرف سے اجلاس کا بائیکاٹ۔

اس کے بعد مزاحمت شدید ہوتی گئی ۔ اسی دوران جنرل ٹکا خان کو صدر جنرل یحییٰ خان نے سویلین گورنر احسن کی جگہ مشرقی پاکستان کا فوجی گورنر اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا۔ عوامی لیگ نے پورے مشرقی پاکستان کو دہشت زدہ کر رکھا تھا۔ اس کی واضح مثال یہ تھی کہ صوبے کے چیف جسٹس نے جنرل ٹکا خان کا حلف لینے سے انکار کر دیا۔ جس کے بعد مغربی پاکستان سے چیف جسٹس بھیج کر حلف دلوایا گیا۔ مشرقی پاکستان میں حالات بد سے بدتر ہو رہے تھے۔ جیل سے تین سو سے زائد خطرناک قیدی سلاخیں توڑ کر فرار ہو گئے ۔ اور انہوں نے بھی اس قتل و غارت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور حالات مزید کشیدگی کی طرف چلے گئے ۔ مارچ کے پہلے ہفتے میں اسی کشیدگی کی وجہ سے ریلوے سروس پی آئی اے کی پروازیں بند ہو گئیں ۔ سیکرٹریٹ کے ملازمین بھاگ گئے ۔ ڈھاکہ ہائی کورٹ کے ججوں اور وکیلوں نے جلوس نکال کر اپنی نفرت کا اظہار کیا اور بنگالیوں نے بڑے پیمانے پر کارروائیوں کا آغاز کیا جس کے نتیجے میں 26 مارچ 1971ء کو فوجی کارروائی کا آغاز ہوا۔ دوسری طرف شیخ مجیب نے بھی ریڈیو پر آزادی کا اعلان کر دیا۔ جنرل ٹکا خان کی فوجی کارروائی سے پاکستان کے متحد رہنے کی تمام امیدیں ختم ہو گئیں ۔ اس دوران شیخ مجیب کو گرفتار کر کے مغربی پاکستان لایا گیا جہاں ان پر بغاوت کی کارروائی ہونی تھی۔

مولانا بھاشانی بھارت بھاگنے میں کامیاب ہو گئے پاکستان فوج کی کارروائیوں کو روکنے کیلئے بہت سی مسلح تنظیمیں سامنے آئیں جن میں مکتی باہنی سب سے موثر کاروائیوں میں ملوث تھی۔ اس جیسی دوسری تنظیموں نے اس فوجی کارروائی سے دسمبر تک فوج کا روپ دھار کر بنگالیوں پر عبرتناک ظلم و تشدد کیا تا کہ ان کے دلوں میں نفرت کو مزید بڑھایا جا سکے ۔ اس کے نتیجے میں سارے بنگالی عوام پاکستانی فوج کے دشمن ہو گئے ۔ بعد ازاں جنرل نیازی ٹکا خان کی جگہ آئے ، انہوں نے بھی تشدد پر زور دیا جس کے بعد بنگالیوں نے ایسی کاروائیاں کیں کہ مرنے والے غیر بنگالیوں کی تعداد لاکھوں میں پہنچتی ہے۔ اسی طرح دسمبر تک خون کی ندیاں بہتی رہیں ۔ ان حالات کے پیش نظر بھارت نے مشرقی محاذ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس جنگ کا باقاعدہ آغاز 22 نومبر 1971ء کو ہوا۔ مشرقی محاذ پر بھارتی فوج نے بڑی تیزی سے حملہ کیا اور وہاں پاکستانی فوج جو اندرونی حالات سے ٹھیک طرح سے ابھی تک نہ سنبھل سکی تھی۔ اس حملے

کو روکنا مشکل دکھائی دیا تو پاکستان نے اس حملے کی شدت میں کمی کرنے کے لیے 3 دسمبر کو مغربی پاکستان کے محاذ پر جنگ کا اعلان کر دیا، اس وقت افواج پاکستان سمیت ساری قوم انتشار اور اپنے لیڈروں کی نا اتفاقی کا شکار تھی جسکی وجہ سے بھارت کو آسان سے فتوحات نصیب ہوئیں۔ اس جنگ میں شکست کی بڑی حد تک ذمہ داری جنرل نیازی پر بھی جاتی ہے جو جنگ کے دوران پاکستانی عوام اور جنرل ہیڈ کوارٹر کو غلط اطلاعات دیتے رہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے کلکتہ پر پاکستانی فوج کے قبضے کی خبر بھی دی۔ اس جنگ سے پہلے بھارت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے اہم ملکوں، جن میں امریکہ بھی شامل تھا' کا دورہ کیا۔ دوسری طرف سفارتی سطح پر بھی بھارت نے سب کو اپنے قابو میں رکھا۔ چین اور امریکہ جنرل یحییٰ کے ذریعے ایک دوسرے کے قریب آئے مگر دونوں نے پاکستان کی فوجی مدد نہ کی۔ ہمارے حکمرانوں نے امریکہ کے ساتویں بحری بیڑے کے انتظار میں آدھا ملک گنوا دیا جبکہ روس نے بھارت کی کھل کر فوجی مدد کی۔

پاکستان کی فضائیہ کی طاقت مشرقی پاکستان میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ صرف ایک سکوارڈن مشرقی پاکستان کے تحفظ کیلئے تھا جو پچھلے آٹھ ماہ سے مسلسل جاری فوجی کاروائیوں سے اپنی طاقت کھو چکا تھا۔ نیوی بھی نہ ہونے کے برابر تھی، جس کی وجہ سے بھارتی فوج نے بغیر کسی دشواری کے اس جنگ کو اپنی جیت میں بدل لیا۔ بھارتی حملے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مکتی باہنی نے اپنی سرگرمیوں کو تیز کر دیا۔ فوج اور عوام کا قتل عام شروع کر دیا، اب وہاں افواج پاکستان کو بیرونی سے زیادہ اندرونی خطرہ تھا۔ مختصر یہ کہ 6 دسمبر تک بھارت فوج نے مکتی باہنی کے ساتھ ملکر سرحد کے قریب واقع انتہائی اہم شہر جیسور پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر حیران کن بات یہ تھی کہ اس کی اطلاع یحییٰ خان تک بھی نہ پہنچ سکی۔ 11 دسمبر کو ملک کے دونوں حصوں کا رابطہ آپس میں ٹوٹ چکا تھا۔ جس کے بعد حکومت پاکستان نے اپنے دوست ممالک سے مدد کی درخواست کی، جو کبھی نہ پہنچ سکی۔ اس جنگ میں اہم موڑ 14 دسمبر کو آیا۔ جب گورنر ایک اجلاس کی صدارت کر رہے تھے کہ بھارتی طیاروں نے گورنر ہاؤس ڈھاکہ پر راکٹ برسائے۔ اس کے فوراً بعد گورنر اور اس کی کابینہ نے استعفیٰ دے دیا اور یحییٰ حکومت کی مزید کارروائیوں سے لاتعلقی کا اظہار کر دیا۔ اس کے ایک دن بعد یعنی 16 دسمبر 1971ء کو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی طاقت سرنگوں ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی دنیا کے ہر کونے سے مسلمانوں کی آہ و پکار سنی گئی، سقوط غرناطہ کے بعد یہ مسلمانوں کی سب سے ذلت آمیز شکست تھی مگر اس کے باوجود ہم نے اپنے ماضی سے کوئی سبق نہیں سیکھا اور اگر آج ہم

موجودہ پاکستان کے حالات دیکھیں تو وہی صورتحال ہے جو 1971ء میں تھی۔ آج کوئی بھی کام قانون اور آئین کے مطابق نہیں ہو رہا۔ جو جتنا "کرپٹ" ہے اس کے پاس اتنا ہی بڑا عہدہ ہے۔ آج کتنے ہی وفاقی اور صوبائی وزراء کسی نہ کسی جرم میں ملوث ہیں۔ ملک آج بھی جرنیلوں' جاگیرداروں اور نوکر شاہی کے پنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ ملک میں صوبائی تعصب عروج پر ہے، ہر جماعت اپنے مفاد کی خاطر تو آواز بلند کرتی ہے مگر جن مظلوم عوام کے ووٹوں سے وہ اسمبلیوں تک پہنچے ہیں، ان کے مسائل کیلئے کوئی احتجاجی مظاہرہ نہیں ہوتا۔ آج بھی 1971ء کی طرح میڈیا اور لٹریچر کے ذریعے نوجوانوں کو نظریہ پاکستان کے خلاف بھڑکایا جا رہا ہے۔ ہر صوبے میں بغاوت کے عناصر سر اٹھا رہے ہیں۔ ہم نے پہلے بھی اس وطن عزیز کا ایک حصہ کھو دیا ہے اور دوسرے کو تباہی کے دہانے پر کھڑا کر دیا ہے۔

اب یہ وقت کی اشد ضرورت ہے کہ ذاتی مفادات کو چھوڑ کر ملک کی بالادستی کے لئے متحد ہو جائیں۔ ہم نے ملکی تاریخ کو اپنی ذاتی دشمنیوں اور مفادات کے لئے پہلے ہی بہت "شرمناک" بنا دیا ہے۔ آج تمام دنیا ہمارے ایٹمی طاقت ہونے پر ناخوش ہے اور کسی نہ کسی طرح ہمیں تباہ کرنے کے درپے ہے۔ خدا کے لئے متحد ہو کر ملک کی سلامتی کو یقینی بنائیں کیونکہ ہم نے ہمیشہ کچھ کھویا ہی ہے اور اب مزید کھونے کے لئے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ جو وقار بچا ہے ہم اسی کو بچا لیں تو یہ ہماری جیت ہوگی۔

سقوط کابل

افغانستان کا نام زبان پر آتے ہی ذہنوں میں بے بس اور مظلوم افغانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی کہانی سامنے لکھی دکھائی دیتی ہے۔ دنیا کی سب سے بے بس اور پسماندہ قوم نے ہمیشہ جبرو ستم میں ہی سانسیں لی ہیں۔ جغرافیائی لحاظ سے افغانستان خشکی میں گھرا ہوا ملک ہے جس کا رقبہ 2530861 مربع میل ہے۔ افغانستان جنوبی اور وسطی ایشیاء کے درمیان واقع ہے۔ جس کی وجہ سے خطے میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس ملک کی اہمیت میں تب بہت اضافہ ہوا جب انیسویں صدی میں یہ ملک روس اور برطانیہ کے درمیان کھیلے جانے والے عظیم سیاسی کھیل کا مرکز بنا رہا۔ اس کے علاوہ یہ ملک روس کی گرم پانیوں تک رسائی میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا رہا۔ جس کی وجہ سے یہ ملک دوسری بڑی طاقتوں کی نظروں میں بھی اہمیت حاصل کر گیا۔

افغانستان کے شمال میں ازبکستان، تاجکستان اور ترکمانستان واقع ہیں۔ جبکہ مغرب میں ایران، جنوب اور مشرق میں پاکستان اور بالائی شمال مشرق میں چین واقع ہے۔ افغانستان کے محل وقوع نے ہمیشہ اس کی آبادی کی تشکیل اور سیاسی تاریخ پر گہرے اثرات ڈالے ہیں جس کا اندازہ ہم اس سے لگا سکتے ہیں کہ افغانستان میں مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ مثلاً پشتون، تاجک، فارسی دان، قزلباش، ہزارہ، ریمق، مغل، ازبک، ترکمان، کرغیز، پامیر، بلوچ، بروہی، نورستانی، کوہستانی، گجر، جٹ، عرب، ہندو، سکھ اور یہودی آباد ہیں۔ افغانستان کی 99 فیصد آبادی مسلمان ہے جبکہ 80 فیصد کے قریب کا تعلق سنی مسلک سے ہے اور باقی کا شیعہ مکتبۂ فکر سے ہے۔ افغانستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔ اس کی 80 فیصد آبادی کھیتی باڑی کرتی ہے۔ افغانستان کے لوگوں کا طرزِ زندگی روایتی ہے۔

اگر ہم افغانستان کی تاریخ کا جائزہ لیں تو اس کے ہر موڑ پر خون سے لت پت انسانوں کی لاشوں کے ڈھیر نظر آئیں گے۔ قبائلی نظام زیادہ اور مختلف نسلوں لوگوں کے افغانستان میں رہنے سے نسلی

تعصب بڑھا اور افغانستان ہمیشہ خانہ جنگی کی حالت میں رہا۔ مگر افغانستان کی تاریخ میں اہم دور تب آیا جب 10 فروری 1919ء کو امیر حبیب اللہ کو افغان یوتھ تنظیم کے ایک رکن نے قتل کر دیا۔ ان کی موت کے بعد ان کے دو بیٹوں نصر اللہ خان اور امان اللہ خان نے بالترتیب 19 اور 20 فروری 1919ء کو اپنی اپنی بادشاہتوں کا اعلان کیا۔ اس طرح دو بھائیوں کے درمیان اقتدار کی جنگ چھڑ گئی۔ امان اللہ خان کو سیاسی تنظیم ''جھینگ پارٹی'' کی حمایت حاصل تھی جو پہلی جنگ عظیم پر قائم ہوئی اور امان اللہ کو بھائی کی نسبت عوام کی بھی حمایت حاصل تھی۔ اسی اثنا میں روس اور برطانیہ کی طرف سے امان اللہ پر ان سے معاہدہ کرنے کے لیے دباؤ بڑھتا گیا۔ 3 مارچ 1919ء کو امان اللہ خان نے ہندوستان کے وائسرائے کو لکھا کہ اگر افغانستان کی علاقائی خود مختاری اور قومی یکجہتی کا احترام کیا جائے تو برطانیہ سے معاہدہ ہو سکتا ہے۔ جس کے جواب میں مئی 1919ء میں برطانیہ نے اپنی فوج افغانستان میں داخل کر دی۔ اس طرح برطانیہ اور افغانستان کے درمیان تیسری جنگ شروع ہو گئی۔ برطانیہ اس وقت کی سپر پاور تھی اور افغانستان اس کی جارحیت کو روکنے میں یقینی طور ناکام رہ جاتا مگر امان اللہ خان نے اس حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے روس کو دوستی کا پیغام بھجوایا اور امداد طلب کی۔ بعد ازاں ہر برطانوی کاروائی روس اور افغانستان کو مزید قریب لے آئی۔ اسی اثنا میں 18 اکتوبر 1919ء کو ریڈیو ماسکو نے ایک نشریے میں کہا کہ افغانستان روس کی مدد سے برطانیہ کو ایشیا سے نکال دے گا۔ اس جنگ کی وجہ سے افغانستان اور روس کے تعلقات میں بڑی مضبوطی آئی۔ 1921ء میں ایک معاہدے کے تحت روس افغانستان کو اس کا صوبہ پنجدیہ واپس کرے گا جس پر 1985ء میں ایک معاہدے کے تحت روس نے زبردستی قبضہ کر لیا تھا۔ اسی دوران افغانستان نے روس کی آشیرباد پر ہندوستان کے مسلمانوں کو برطانیہ کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا اور سونے پر سہاگہ یہ کہ اس وقت ہندوستان میں تحریک خلافت چل رہی تھی، جس کی وجہ سے مسلمانوں کے جذبۂ ایمانی کو برطانیہ کے خلاف استعمال کیا گیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو امان اللہ خان نے ہجرت کی دعوت دی اور حوصلہ افزائی کی۔ ہندوستانی لیڈروں پر مشتمل کابل میں ایک جلاوطن حکومت قائم کی گئی س کے صدر مہندر پرتاپ، وزیر اعظم مولانا برکت اللہ اور وزیر خارجہ عبید اللہ سندھی تھے۔ اس طرح روس نے برطانیہ کے خلاف چلنے والی اس تحریک کی مکمل پشت پناہی کی۔ انہی دنوں ترکی کے کمال پاشا اتاترک افغانستان آئے اور انہوں نے یہاں پر کمیونسٹ نظریات پھیلانے شروع کر دیئے۔ اس طرح افغانستان میں کمیونسٹ نظریات تیزی سے پھیلنے لگے جس کے نتیجے میں افغان

سیاست اور حکومت میں روس کا عمل و دخل بڑھتا گیا۔ روس نے برطانوی استعماریت کے خلاف خوب پروپیگنڈہ کیا اور اس تاثر کو ابھارا کہ برطانیہ افغانستان پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔

1922ء میں پہلی مرتبہ افغانستان میں منو جرگہ معرض وجود میں آیا۔ اس جرگہ کے بیشتر ارکان برطانیہ کے مخالف اور افغان قومیت کے حامی تھے۔ جنہوں نے پہلی مرتبہ مارکسزم کے قومیت سے متعلقہ پہلوؤں کا پروپیگنڈہ کیا۔ سوشلسٹ نظریات پھیلانے والوں میں ابراہیم بیگ اور عبدالرحمان پیش پیش تھے۔ اس طرح امان اللہ کے دور میں ایک طرف افغانستان اور روس کے درمیان سفارتی تعلقات قائم ہوئے اور کمیونسٹ نظریات کی اشاعت و تشہیر کا آغاز ہوا اور دوسری طرف برطانیہ اور افغانستان کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوگئی۔ دریں اثنا امان اللہ نے بعض ایسے اقدامات کیے جن کی وجہ سے اندرون ملک لوگ ان کے مخالف ہو گئے۔ مثلاً عورتوں کا پردہ ختم کر دیا گیا، حصول تعلیم کے لیے عورتوں کو بیرون ملک بھیجا گیا، جمعہ کی بجائے جمعرات کو قومی تعطیل کا دن قرار دیا گیا۔ ان اقدامات پر حبیب اللہ نامی شخص نے ان کے خلاف بغاوت کر دی۔ جسے برطانیہ کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس کے نتیجے میں امان اللہ کو جلاوطن ہونا پڑا اور حبیب اللہ خان کو بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ مگر صرف نو ماہ بعد نادر شاہ نے ان کا تختہ الٹ دیا اور اکتوبر میں انہیں بھی جلاوطن کر دیا۔ نادر شاہ نے امان اللہ کے حامیوں کو جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیا یا پھر قید میں ڈال دیا۔ اس کے باوجود امان اللہ کی حامی افغان یوتھ نے اپنی سرگرمیاں زیر زمین جاری رکھیں۔ 17 اپریل 1933ء کو جب نادر شاہ ایک سکول کی تقریب تقسیم انعامات کے لیے گئے تو وہاں پر تین طلباء نے انہیں قتل کر دیا۔ جس کے بعد ان کے 19 سالہ بیٹے ظاہر شاہ کو بادشاہ بنا دیا گیا۔

1947ء میں ویش زالمے (باشعور نوجوان) کے نام سے ایک سیاسی تحریک معرض وجود میں آئی جس نے بعد ازاں افغان سیاست میں اہم کردار ادا کیا۔ اس تحریک میں ہر قسم کے نظریات رکھنے والے افراد موجود تھے۔ نور محمد ترکئی نے ایک سرکاری رسالے "کابل میگزین" میں کارل مارکس، لینن اور دوسرے کمیونسٹ لیڈروں کے حالات زندگی لکھے۔ انہی دنوں سردار داؤد نے ایک سیاسی تنظیم کلب پشتوں کی داغ بیل ڈالی۔ ببرک کارمل اس گروپ کے عظیم کارکن تھے۔ اس کے علاوہ لاتعداد نیشنلسٹ اور کمیونسٹ اس گروپ میں شامل تھے۔ اس گروپ میں شاہی خاندان کے مخالفین نے بھی شرکت کی۔ اسی سیاسی تحریک میں نور ترکئی اور حفیظ اللہ امین پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے ملے۔ اس پہلی ملاقات میں دونوں نے سردار داؤد اور سوویت یونین کے ساتھ وفاداری کا عہد کیا۔ کیونکہ اس تنظیم میں شامل ہونے والے کو روس

اور سردار داؤد کی وفاداری کا قرار کرنا پڑتا تھا۔منظم ہونے کے بعد 1951ء میں اس تنظیم کے ارکان نے عوام کے حقوق کے حصول کے لیے شاہ محمود خان کی حکومت کے خلاف بہت بڑا جلوس نکالا اور مظاہرہ کیا۔اس گروپ کے ممتاز ارکان کو قید کرلیا گیا۔دوسرے رہنماؤں کے علاوہ ببرک کرمل اور ترکئی بھی شامل تھے۔لیکن دو سال بعد 1953ء میں سردار داؤد کے برسر اقتدار آنے کے بعد وہ رہا کردیئے گئے۔

55-1954ء میں پاکستان اور امریکہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔جب پاکستان سیٹو اور سینٹو کے معاہدوں میں شامل ہوگیا اور 1959ء میں پاکستان اور امریکہ کے درمیان دوطرفہ فوجی معاہدہ جس کے تحت پاکستان پر روسی حملے کی صورت میں امریکہ نے پاکستان کا دفاع کرنے کا وعدہ کیا۔ان واقعات کے بعد روس نے پاکستان کے بارے میں اپنی معاندانہ پالیسی مزید سخت کردی اور افغانستان و بھارت کو پاکستان کے خلاف ابھارا۔یاد رہے کہ افغانستان دنیا کا واحد ملک تھا جس نے اقوام متحدہ میں پاکستان کے داخلے کی مخالفت کی۔روس کے ذرائع ابلاغ نے پاکستان اور امریکہ کے باہمی معاہدات کو افغانستان کی سالمیت کے لیے خطرہ قرار دیا جس کی وجہ سے افغانستان کا جھکاؤ روس کی طرف بڑھتا گیا۔

15 دسمبر 1955ء کو روسی کمیونسٹ پارٹی کے سربراہ خوروشیف نے اپنے دورۂ افغانستان کے دوران ایک ارب کی امداد کا اعلان کیا۔افغانستان کے پہلے پانچسالہ منصوبے کے لیے روس نے زیادہ سے زیادہ رقم فراہم کی۔اس کے علاوہ خوروشیف نے 1959ء میں سردار داؤد سے مل کر اہم مذاکرات کئے،جس کے بعد سردار داؤد نے پختونستان کے مسئلے کو ابھارنا شروع کردیا اور افغانستان کے اس موقف کی روس نے مکمل حمایت کی۔مختصر یہ کہ سردار داؤد کے 20 سالہ دور اقتدار میں افغانستان میں کمیونسٹ تحریک کی بنیادیں پختہ ہوگئیں اور کمیونسٹ افغانستان میں مضبوط ہوگئے۔دوسرے الفاظ میں ہم یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ یہ سردار داؤد ہی تھا جس کی مہربانیوں کی وجہ سے روسیوں کی افغانستان میں داخلے کی راہ ہموار ہوئی۔اس کا اندازہ ہم اس بات سے بھی بخوبی لگا سکتے ہیں کہ سردار داؤد نے اپنے روس کیساتھ تعلقات کو خفیہ رکھا۔مختصر یہ کہ 1975ء میں سردار داؤد کا ذہن تبدیل ہوا کیونکہ افغانستان کے بارے میں روسی عزائم ان پر واضح ہوگئے اور انہوں نے بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے اپنے دوستوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے کوشش شروع کردی۔انہوں نے روس پر انحصار کم کرکے افغانستان کے غیر جانبدارانہ تشخص کو ابھارا اور مسلم ممالک کے ساتھ خوشگوار تعلقات کے قیام کا آغاز کیا۔ایران نے کابل

سے بندر عباس تک سڑک قائم کرنے پر رضامندی ظاہر کی تا کہ افغانستان دوسرے ملکوں کو اپنی برآمدات روس کی بجائے ایرانی بندرگاہ سے بھیج سکے اور درآمدی اشیاء بندر عباس سے کابل لا سکے۔ اسی طرح افغان فوجی افسروں کو تربیت کے لیے روس کی بجائے پاکستان، بھارت اور مصر بھیجا جانے لگا۔ سردار داؤد نے تمام مسلم اور غیر جانبدار ممالک کا دورہ کیا اور ستمبر 1978ء کو وہ امریکہ کے دورے پر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ یہ خبر پھیلی کہ افغانستان آر سی ڈی میں شامل ہو رہا ہے۔ اندرون ملک سردار داؤد نے کمیونسٹوں سے سختی شروع کر دی اور کمیونسٹ وزراء کو برطرف کر دیا۔ اس کے علاوہ ساٹھ کے قریب بری اور ہوائی فوج کے اعلیٰ افسروں کو بھی سبکدوش کر دیا گیا۔ کیونکہ یہ روس کے تربیت یافتہ حامی تھے۔ سردار داؤد نے قبائلی سرداروں اور مذہبی طبقے کے ساتھ نرمی برتنا شروع کر دی۔ ان تمام اقدامات نے افغانستان میں کمیونسٹ پارٹی کی تحریک پر کاری ضرب لگائی اور وہاں کمیونسٹ تحریک کے خاتمے کا امکان پیدا ہو گیا۔ یہ بات سوویت یونین کے لیے نا قابل برداشت تھی۔ چنانچہ اس نے خلق اور پرچم کو اکٹھا کرنے کے لیے اپنے تمام وسائل استعمال کیے اور بھارتی کمیونسٹ پارٹی نے اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا اور ان دونوں متحارب گروپوں کے کئی خفیہ اجلاس نئی دہلی میں ہوئے۔ اس کے بعد 18 اپریل 1978ء کو معروف کمیونسٹ رہنما میر اکبر خیبر کو قتل کر دیا گیا جس پر 10 ہزار کمیونسٹوں نے سردار داؤد کے خلاف مظاہرہ کیا۔ نور محمد ترکئی، ببرک کرمل اور دیگر کمیونسٹ لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا اور بعض اطلاعات کے مطابق سردار داؤد ان لیڈروں کو پھانسی چڑھانے کا فیصلہ کر چکے تھے، مگر ہوائی فوج کے ڈپٹی کمانڈر انچیف کرنل عبدالقدیر نے 28 اپریل 1975ء کو ان کا تختہ الٹ دیا۔ داؤد اور ان کے خاندان کے تمام افراد قتل کر دیئے گئے۔ اس فوجی خونی انقلاب کے نتیجے میں روس نواز کمیونسٹ افغانستان کے اقتدار پر 28 اپریل 1978ء کو قابض ہو گئے۔ نور محمد ترکئی کو افغان حکومت کا صدر اور ببرک کرمل کو نائب صدر بنایا گیا۔ اسکے علاوہ گیارہ وزیر خلق اور دس پرچم سے لئے گئے۔ ترکئی نے اپنی حکومت پر کمیونزم کا لیبل لگانے سے اجتناب کیا۔ بلکہ افغان قومیت، معاشرتی واقتصادی انصاف اور غیر جانبدرانہ خارجہ پالیسی کو اپنی حکومت کا لائحہ عمل ٹھہرایا۔

کمیونسٹ حکومت کے افغانستان میں برسر اقتدار آنے کے بعد صرف چھ ماہ میں روس کے اتحادی ممالک اور افغانستان کے درمیان 25 معاہدے ہوئے جن کے تحت روس نے افغانستان کو 14000 ملین ڈالر امداد دینے کا وعدہ کیا۔ 1955ء سے 1978ء تک روس نے تیسری دنیا کے ممالک میں سب

سے زیادہ امداد افغانستان کو دی جس کی مالیت 1105 ارب ڈالر بنتی تھی۔فوجی امداد اس کے علاوہ تھی۔ ان حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان روس کے لیے کتنا اہم ملک تھا۔ دستاویزی اعداد وشمار کے مطابق مذکورہ عرصہ میں افغانستان کو 65 فیصد امداد روس نے اور 23 فیصد امداد امریکہ نے اور 9 فیصد مغربی جرمنی نے مہیا کی۔ روس نے 1955ء میں افغانستان کو اڑھائی کروڑ ڈالر کی امداد دی جبکہ 1967ء میں یہ امداد دو ارب سات کروڑ ڈالر اور 1970ء میں چار ارب پانچ کروڑ ڈالر دی گئی۔ یعنی ہر سال 25 ملین ڈالر کی فوجی امداد دی گئی اور 1973ء میں یہ ایک ارب ڈالر سالانہ کر دی گئی۔ اس طرح 1978ء تک روس نے افغانستان کی بری اور ہوائی فوج کے ایک لاکھ افسروں کو تربیت دی اور پچاس ہزار کے قریب افغان سول افسروں واہلکاروں کو مختلف شعبوں میں تربیت دی گئی۔

نور محمد ترکئی نے اقتدار میں آتے ہی داؤد کے حامیوں اور اسلام پسند طبقوں کو اپنے ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا اور ان پر بے پناہ ظلم کئے جس کی وجہ سے افغان عوام اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور کمیونسٹ انقلاب کا مقابلہ کرنے کے لیے اسلام سے محبت کرنے والے افغان قبائل نے 1979ء کے وسط میں مسلح جدوجہد کا آغاز کیا اور اس تحریک نے بہت کم عرصہ میں غیر متوقع کامیابی حاصل کیں جن کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ 28 میں سے 23 صوبوں پر تحریک آزادی کے حریت پسندوں کا قبضہ تھا۔ دوسری طرف خلق اور پرچم ایک مرتبہ پھر جدا ہوگئیں۔ ببرک کرمل نے ترکئی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے فوج اور روس کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ ببرک کرمل اور ان کے پرچمی ساتھیوں کو بیرونی ممالک سفیر بنا کر بھیج دیا گیا۔ اسی دوران 5 دسمبر 1978ء کو ترکئی نے روس کے ساتھ دوستی اور تعاون کے 20 سالہ معاہدے پر دستخط کئے۔ ترکئی حکومت کے مؤثر فرد حفیظ اللہ امین تھے۔ جن کا فوج میں بھی خاصا اثر تھا۔ چنانچہ حفیظ اللہ امین نے باہمی اختلافات کی بنیاد پر 16 ستمبر 1979ء کو نور محمد ترکئی کو اس کے اہل خانہ کیساتھ قتل کر دیا۔ امین سیاسی نقطۂ نظر سے آزاد سوچ کا مالک تھا۔ اس کا زیادہ جھکاؤ مغرب کی طرف تھا۔ اس لیے اس نے امریکہ کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی اور افغانستان میں امریکی سفیر کیساتھ قلیل عرصہ میں 12 ملاقاتیں کیں اور دسمبر کے وسط میں اس نے پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق کو بھی خیر سگالی کا پیغام بھیجا۔ یہ تمام چیزیں روس کے لیے سخت تشویش ناک تھیں۔ وہ حفیظ اللہ امین کی اس قسم کی سرگرمیوں کو کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

بعض خفیہ رپورٹوں کے مطابق حفیظ اللہ امین نے افغان مجاہدین سے بھی کہا کہ وہ روسی مشیروں کو

افغانستان سے نکالیں اور وہاں روسی اثر کو کم کرنے کے لیے اس کی مدد کریں۔ اس نے خلق پارٹی کے ارکان میں ایک پمفلٹ تقسیم کیا جس میں کہا گیا تھا کہ روس اسے قتل کرانا چاہتا ہے۔ یہ پمفلٹ افغانستان میں روسیوں کے ہاتھ لگ گیا۔ اس کے علاوہ حفیظ امین نے اپنے ایک انٹرویو میں انکشاف کیا کہ ''ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کی گئی تھی مگر انہیں اس کا بروقت علم ہوگیا۔'' اگر ہم اس کے تناظر میں سوچیں تو معلوم ہوگا کہ روسیوں نے حفیظ امین کی حکومت کے خاتمے کی کوشش کی اور اس میں ناکامی کی صورت میں باقاعدہ فوجی حملے کی تیاری شروع کردی۔

حملے کی منصوبہ بندی اور تیاریوں کا آغاز اپریل 1979ء میں کیا گیا۔ اس عمل کو عملی جامہ پہنانے میں تقریباً آٹھ ماہ لگے اور بالآخر 25 دسمبر 1979ء کو اس طویل جنگ کا باقاعدہ آغاز ہوا جس کے مستقبل کے متعلق یقین سے کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس وقت تک افغان سرحدوں کے ساتھ جدید اسلحہ سے لیس چھ ڈویژن روسی فوج پہنچ چکی تھی۔

چنانچہ 25 دسمبر کو سوویت ہوائی فوج کے دستے نے کابل کے ہوائی اڈے پر اچانک حملہ کر کے صرف پانچ گھنٹوں کے اندر کابل ایئرپورٹ پر قبضہ کرلیا۔ اسی طرح شاہی محل پر روسی فوج نے حملہ کیا اور امین کی حفاظتی فوج کے ہاتھوں ایک روسی جنرل لیفٹننٹ جنرل وکٹور یاپوٹن ہلاک ہوگئے مگر اس کے باوجود روسیوں نے حفیظ اور اس کے سیکورٹی کو ہلاک کردیا اور محل پر قبضہ کرلیا جس کے بعد ۲۶ دسمبر کو فوری طور پر وزارت داخلہ، ریڈیو اور وزارتِ دفاع کے دفاتر پر قبضہ کرلیا گیا۔

اس کے بعد صرف 24 گھنٹوں کے دوران 250 روسی ہوائی جہاز فوجی ساز وسامان اور فوج کو لے کر کابل کے ہوائی اڈے پر اترے اور جنوری کے وسط تک افغانستان میں روسی فوجیوں کی تعداد 25 ہزار ہو چکی تھی۔ ان فوجوں کا تعلق سوویت یونین کی مسلم ریاستوں سے تھا اس لیے ان میں اکثر مسلمان تھے جو روس کا پہلے سے تیار شدہ منصوبہ تھا تا کہ نقصان دونوں طرف سے مسلمانوں کو ہو اور جیت بر حال میں روس کے قدم چومے۔ ان فوجیوں کی تعداد فروری 1980ء تک 60 ہزار ہوگئی۔ اس کے سربراہ Marshal Serguei Sokolov تھے۔ اس دوران روسی طیاروں نے افغانستان کے مشرقی حصے پر 25 طیاروں نے اتنی خوفناک بمباری کی تھی کہ وہاں کے باشندے ہجرت پر مجبور ہو گئے اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ پاکستان آئے اس کے علاوہ ایران، امریکہ اور دیگر مغربی ملکوں میں پناہ حاصل کی۔ تقریباً 30 لاکھ سے زیادہ افغان باشندوں نے پاکستان میں، 20 لاکھ ایران میں اور 12 ہزار کے

قریب امریکہ میں پناہ حاصل کی۔ جبکہ 20 لاکھ کے قریب افغانستان کے اندر در بدر ٹھوکریں کھاتے رہے اور سوویت فوج کا ظلم وستم برداشت کرتے رہے۔ مزاحمت کو کمزور کرنے کے لیے روسی فوج نے بمباری اور گولہ باری کر کے لاتعداد گاؤں تباہ و برباد کیے۔

زرخیز زمین کو آتشی اور زہریلے مادے کے ذریعے ناکارہ بنایا گیا تالابوں کے اندر پانی میں زہر ملا دیا گیا۔ حفظان صحت کے مراکز ختم کر دیئے گئے۔ یہ تمام اقدامات افغان عوام کو غلام بنانے اور نسل کشی کے لیے کئے گئے تھے۔

روسی فوج نے افغان مجاہدین کی تحریک مزاحمت کو روکنے کے لیے اپنے تمام تر وسائل استعمال کئے جن میں فوجی، مالی، سیاسی اور اقتصادی حربے شامل تھے مگر روس کے تمام حربے ناکام ہوئے۔ روسی فوج نے اس حکمت عملی کو اختیار کیا جو 1920ء میں سوویت فوج نے وسطی ایشیا کے قبائل کی تحریک آزادی کو کچلنے کے لیے اپنائی تھی۔ روسی فوج نے شہروں اور دیہاتوں کو ملانے والی شاہراہوں اور سڑکوں کو تباہ کر دیا۔ خوراک کے ذخیروں کو آگ لگا دی۔ پینے والے پانی کے ذخیروں میں زہر ملا دیا۔ مواصلات اور نقل وحرکت کے ذرائع ختم کر دیئے مگر افغانستان میں صورت حال مختلف تھی۔ اس کی جغرافیائی اہمیت کے پیش نظر یہاں روسیوں کے خلاف کارروائیوں کا زیادہ امکان تھا۔ اس کے علاوہ ہمسایہ ممالک سے بالعموم اور پاکستان سے بالخصوص تعاون کا مجاہدین کو یقین دلایا گیا۔ یہی وہ مؤثر اقدام تھا جس کی وجہ سے روس افغانستان کے دوسرے علاقوں تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔ جس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ افغانستان کی 85 فیصد آبادی پر افغان مجاہدین اور 15 فیصد پر روس قابض ہو سکا۔

اسی دوران جب امریکہ نے دیکھا کہ افغان مجاہدین اتنے کم وسائل کے باوجود روس جیسی طاقت کو روکے ہوئے ہے تو اگر ان کی مدد کی جائے تو روس کی شکست یقینی ہو جائے گی۔ اس طرح امریکہ نے پاکستان کے ذریعے افغانستان کی بھرپور مدد کی۔ افغان مجاہدین کے علاوہ تمام مسلم دنیا سے مجاہدین کو اس محاذ پر بلایا گیا۔ روس کے پاس جدید اسلحے کے ساتھ ساتھ فضائی طاقت بھی موجود تھی جو افغان مجاہدین کے پاس نہیں تھی۔ دنیا کی سب سے بڑی لڑی جانے والی اس گوریلا جنگ میں مجاہدین نے دنیا کی دوسری سب سے بڑی طاقت کو ناکوں چنے چبوا دیئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ تحریک مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔

مختصر یہ کہ بعد ازاں مجاہدین اس قدر مضبوط ہو چکے تھے کہ ان کو دبانا روس کے بس میں نہ رہا کیونکہ وہ

اپنی تمام تر فوجی واقتصادی قوت، جدید ٹیکنالوجی، سیاسی اثر ورسوخ، جدید اسلحہ اور فوجی اور سیاسی حربے استعمال کرنے کے باوجود اڑھائی لاکھ مربع میل پر پھیلے ہوئے ملک کے صرف ۲۰ فیصد حصہ پر آٹھ برسوں میں قابض ہو سکا۔ اور اس وقت کی ڈیڑھ کروڑ آبادی میں صرف ۱۵ فیصد آبادی پر وہ کنٹرول حاصل کر سکا۔ اس کے علاوہ عالمی سطح پر بھی روس کے اس قدام کی مزاحمت کی گئی اور عالمی برادری نے مجاہدین کا ساتھ دیا اور بار بار روسی فوج سے افغانستان سے جانے کا مطالبہ کیا جس کا مطلب یہ ہوا کہ مجاہدین نے روس کو فوجی اور سیاسی دونوں محاذوں پر شکست دی۔

مختصر یہ کہ روس اندرونی اور بیرونی طور پر ٹوٹ چکا تھا۔ ملک میں بے روزگاری اور بے یقینی کی کیفیت تھی۔ آخرکار 30 نومبر 1987ء کو ڈاکٹر نجیب نے افغانستان کے مسئلہ پر عالمی کانفرنس بلانے کی تجویز دی اور افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کے لیے 12 ماہ کی مدت کا اعلان کیا۔ 1979ء میں روس کے افغانستان پر حملے کے بعد اقوام متحدہ نے جنگ بند کروانے اور مسئلہ افغانستان کا سیاسی حل تلاش کرنے کے لیے تمام فریقوں سے بار بار رابطہ کیا اور آخرکار وہ اس میں تب کامیاب ہوئے جب جون 1982ء میں افغانستان، پاکستان، ایران اور سوویت یونین مذاکرات میں شامل تھے۔ بالواسطہ مذاکرات پر آمادہ ہوئے جس کے بعد اقوام متحدہ کی وساطت سے جنیوا میں فریقین کے درمیان مذاکرات کا آغاز ہوا۔ ان مذاکرات کا ایجنڈا درج ذیل چار نکات پر مشتمل تھا:

1...... افغانستان سے روسی افواج کی واپسی۔

2...... پاکستان اور ایران میں پناہ حاصل کرنے والے باشندوں کی باعزت اور باحفاظت اپنے وطن واپسی۔

3...... فریقین کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کی یقین دہانی۔

4...... بیرونی عدم مداخلت کے لیے یقین دہانی کے طور پر عالمی ضمانتوں کی فراہمی۔

12 جون 1986ء سے لے کر مارچ 1988ء تک 2 سال کے عرصہ میں تقریباً مذاکرات کے دس اجلاس ہوئے اور مذکورہ نکات میں سے متنازعہ نکتہ جس پر طویل عرصہ تک فریقین کے درمیان اختلافات رہا وہ روسی فوجوں کی واپسی کی مدت کا تھا۔ ابتداء میں سوویت یونین نے 18 ماہ کا وقت دیا۔ اس کے بعد اسے کم کر کے 12 ماہ کر دیا جسے پاکستان نے مسترد کر دیا۔ پاکستان کا موقف تھا کہ "روسی فوج نے آنے میں صرف تین ہفتے کا وقت لیا تھا، اسے اب تین ماہ میں واپس جانا ہوگا۔"

چنانچہ 2 مارچ 1988ء کو فریقین کے درمیان جنیوا میں مذاکرات ہوئے جس میں مذکورہ سطور میں بیان کیے گئے چاروں نکات پر فریقین کے درمیان اتفاق رائے ہوگیا۔ مگر جب پاکستان نے روسی انخلاء کے بعد عبوری حکومت کا مطالبہ کیا تو اختلافات نے دوبارہ جڑ پکڑ لی۔ ان کا موقف تھا روسی فوج کے جانے کے بعد فوری طور پر عبوری حکومت قائم ہو جس میں افغان مجاہدین کے مختلف گروپوں کے نمائندوں کو بھی شامل کیا جائے۔ جو بعد ازاں ملک میں انتخابات کرائے اور افغان عوام کی مرضی کی حکومت قائم ہو سکے۔

معاہدہ کے تحت روسی فوج کا افغانستان سے مکمل انخلا 15 فروری 1989ء تک ہونا تھا مگر سوویت یونین نے اس مقررہ تاریخ سے گیارہ دن پہلے یعنی چار فروری کو اپنی فوج واپس بلالی۔ اس روز ایک ہزار گاڑیاں جن میں 34443 روسی فوجی سوار تھے چالیس میل لمبے کارواں کی صورت میں کابل سے روانہ ہوئیں۔ یہ سوویت یونین کی ہزیمت اور افغان عوام کی فتح کا دن تھا۔ کیونکہ ایک بے سروسامان و پسماندہ قوم نے دنیا کی ایک سپر پاور طاقت کو شکست دیکر تاریخ میں ایک انوکھے باب کا اضافہ کیا اور ایک مرتبہ پھر ثابت ہوگیا کہ افغان قوم ناقابل شکست ہے اور طاقت کے زور پر اسے غلام نہیں بنایا جاسکتا۔

اس کے بعد وہی ہوا جس کی سب کو توقع تھی۔ افغانستان میں حالات قابو سے باہر ہو گئے۔ روسیوں کے جانے کے بعد کابل میں کرفیو لگا دیا گیا۔ اور ملک میں ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا گیا۔ ڈاکٹر نجیب نے مجاہدین سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا اور 18 فروری 1989ء کو پارلیمنٹ توڑ دی۔ اس کے بعد طویل بحث و مباحثے کے بعد 24 فروری کو مجاہدین کی عبوری حکومت کے لیے باقاعدہ انتخابات ہوئے جس میں پروفیسر صبغت اللہ مجددی اور پروفیسر عبدالرب رسول بالترتیب 174 اور 172 ووٹ حاصل کر کے صدر اور وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ دیگر امیدواروں میں مولوی محمد نبی محمدی کو 139، انجینئر گلبدین حکمت یار کو 126، مولوی یونس خالص کو 102، پروفیسر برہان الدین ربانی کو 99 اور پیر سید احمد گیلانی کو 86 ووٹ ملے۔

اسی طرح حزب اسلامی کے سربراہ انجینئر گلبدین حکمت یار کو عبوری حکومت کا وزیر خارجہ، جماعت اسلامی کے سربراہ پروفیسر برہان الدین ربانی کو وزیر برائے تعمیر و بحالی، حرکت انقلاب اسلامی کے سربراہ مولوی محمد نبی محمدی کو وزیر دفاع، حزب اسلامی کے سربراہ مولوی یونس خالص کو وزیر داخلہ، محاذ ملی کے سربراہ پیر سید احمد گیلانی کو وزیر تعلیم، خزانہ و اطلاعات ہی چرل انجینئر احمد شاہ مسعود کو وزیر مواصلات،

مولوی محمد شاہ فاضلی کو وزیر برائے سائنس وٹیکنالوجی اور حاجی دین محمد کو قومی سلامتی کا وزیر منتخب کیا گیا۔

اس حکومت کی تشکیل میں ضیاء الحق اور آئی ایس آئی نے بھرپور کردار ادا کیا تھا۔ اس وقت آئی ایس آئی کے سربراہ نے یہ تجویز پاکستان کے مفاد میں دی تھی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ افغانستان پر پاکستان کا اثر ورسوخ بڑھ جاتا۔ کیونکہ ان تمام لیڈروں کا پاکستانی حکومت اور اعلیٰ فوجیوں سے قریبی تعلق تھا اور دوسرا وہ دوران جہاد پاکستانی حکومت کی زیر نگرانی رہے تھے۔ دوسری طرف امریکہ کو بھی اس خطے کی فوجی نقطہ نگاہ سے اہمیت کا پتہ تھا۔ وہ بھی کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح وہ اس ملک میں اپنے پاؤں جمانے میں کامیاب ہو جائے۔ یہ جنگ دراصل ان دو بڑی طاقتوں کے اختلافات ہی کا نتیجہ تھی۔ جب ۱۹۷۷ء کے بعد افغانستان نے امریکہ کی طرف اپنا جھکاؤ کیا تو روس کو اپنی سلامتی خطرے میں نظر آئی۔ اسی طرح امریکہ کے پوری دنیا پر حکمرانی کرنے کے خواب کی تکمیل میں روس سب سے بڑی رکاوٹ تھی جو اقتصادی اور فوجی لحاظ سے ایک بڑی طاقت اور دوسرا سپر پاور تھی۔ امریکہ کا اس خطے میں بہت اثر ورسوخ تھا مگر انقلاب ایران کے بعد وہ اس خطے سے تقریباً جا چکا تھا۔ اس نے ایران پر صدام کی مدد سے جنگ مسلط کروادی تاکہ انقلاب کا اثر دوسرے ممالک تک نہ بڑھ سکے اور اس کے مفادات کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ افغانستان امریکہ کے لیے بہترین ملک تھا، جہاں بیٹھ کر وہ اس خطے پر حکمرانی کر سکتا تھا اور اس کے متعلق منصوبہ بندی وہ کئی سالوں سے کر رہے تھے کیونکہ اس کے ہمسایہ ممالک میں ایران، پاکستان، چین اور سوویت یونین شامل تھے جو تمام کے تمام اہم ممالک تھے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ دو بڑی طاقتوں کی لڑائی واختلافات میں ایک غریب پسماندہ ملک کو تباہ وبرباد کر دیا گیا۔

نو سال کے عرصہ میں 13310 سوویت فوجی ہلاک، 35478 زخمی اور 311 لاپتہ ہوئے۔ دوسری طرف افغانستان کے باشندوں اور مجاہدین کو ملا کر تقریباً چار لاکھ سے لیکر 10 لاکھ تک لوگ مختلف حادثوں سے ہلاک ہوئے۔ اس طرح افغانستان کے باشندوں کو دوسرے ممالک میں پناہ گزین ہو کر زندگی بسر کرنی پڑی۔ 1988ء میں دنیا بھر میں سب سے زیادہ تعداد افغان مہاجرین کی تھی۔ روسی حملے سے افغانوں کی تقریباً نصف سے بھی زیادہ آبادی متاثر ہوئی۔ 20 لاکھ افغان مہاجر صرف پاکستان میں تھے۔ ان کو 318 مہاجر کیمپوں میں تمام ممکنہ سہولتیں فراہم کی گئیں۔ ان پناہ گزینوں میں 45 فیصد بچے، 28 فیصد عورتیں اور 25 فیصد مرد تھے۔ ان کی موجودگی میں پاکستان میں بیروزگاری اور غربت کی شرح میں کافی اضافہ ہوا۔

جنگ کے آغاز پر روسی رہنماؤں کو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ یہ جنگ اس قدر طویل ہو جائے گی اور انہیں افغان مجاہدین اور عوام کی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان کا خیال تھا کہ جلد ہی انہیں پورے افغانستان پر کنٹرول حاصل ہو جائے گا جس کے بعد وہ آگے بڑھنے کے لیے منصوبہ بندی کریں گے۔ مگر وہ اس منصوبہ بندی میں ناکام رہے، جس کا ردعمل روس کے اندر بھی ظاہر ہوا کیونکہ ایک طرف یہ جنگ روسی معیشت پر بوجھ بن گئی اور دیمک کی طرح اسے چاٹنے لگی اور دوسری طرف عالمی سطح پر اس کے لیے بدنامی کا باعث بن گئی۔ روس میں اس جنگ کے خلاف زیادہ شور وغل اور ہنگامے تب ہوئے جب افغان مجاہدین کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے روسیوں کی لاشیں ان کے عزیز و اقارب کے ہاں پہنچنے لگیں۔ اس کے علاوہ روسی فوجی جنگ کی طوالت اور خوفناک انجام کے ڈر سے فرار ہونے لگے۔ روسی فوجیوں کے ہلاک وزخمی ہونے کی یومیہ شرح تین سوتھی۔ اس جنگ پر سوویت یونین کو چالیس لاکھ ڈالر یومیہ اور 1207 ارب ڈالر سالانہ خرچ کرنے پڑے۔

اس حملے کے بعد ہی افغان عوام اور وسطی ایشیا میں رہنے والے مسلمانوں میں رابطے بڑھے اور اس جنگ کے نتیجے میں سوویت مسلمانوں کا مسلم دنیا سے رابطہ بحال ہوا۔ یاد رہے 70 برس سے سوویت یونین نے وسطی ایشیا کے مسلمانوں کو بیرونی دنیا سے الگ تھلگ کیے رکھا۔ ان کے دلوں سے مذہب کو نکالنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اسکے لیے مساجد کو تباہ کر دیا گیا۔ قرآنی تعلیمات کی درس وتدریس پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس جنگ کے نتائج کے بعد سوویت مسلمانوں کو اتنا حوصلہ ملا کہ وہ اپنے آزاد ہونے کی کوششیں کرنے لگے۔ دوسری طرف سوویت یونین بھی انتشار کے دہانے پر کھڑا تھا۔ اس وقت کے روسی سربراہ گورباچوف نے سوویت یونین کا اقتدار سنبھالنے کے بعد تیزی سے اپنی پالیسیوں کو اصلاحات کے نام پر روبہ عمل لانا شروع کیا تو کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ کمیونسٹ خرابیوں کو دور کرنے کے لیے یہی اصلاحات تاریخ میں ایک بڑے دن پر منتج ہوں گی۔ انہوں نے روسی سسٹم میں فوری تبدیلیوں کی ضرورت اور انقلابی معاشی ترقی کو ایک نیا رخ دینے پر زور دیا۔ گورباچوف کی ان اصلاحات کے بتدریج آگے بڑھنے سے روس میں جمہوریت پسندوں کو سامنے آنے کا موقع ملا۔ تاہم روس کے اندر پکے نظریاتی اور کٹر کمیونسٹوں کی ایک بڑی تعداد اپنے نظریات پر قائم رہی۔ ان کٹر کمیونسٹوں کے پاس انتظامیہ سے لے کر فوج میں کلیدی عہدے موجود تھے۔ 1990ء میں جب سوویت یونین انتشار کے دہانے پر کھڑا تھا، ان کمیونسٹوں نے گورباچوف کے ارادے بھانپ کر ان کو اقتدار سے الگ کرنے کی

باتیں شروع کر دیں۔

19 اگست 1991ء میں گورباچوف کے خلاف نائب صدر گیناڈی یاناباف نے سوویت کے فضائیہ اور بحری فوج کے دو ڈویژنوں کی مدد سے فوجی بغاوت کی اور انہیں گرفتار کر لیا گیا اور کچھ دنوں کے لیے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس دوران بورس یلسن ایک بڑے عوامی لیڈر کی حیثیت سے قومی اور عالمی سیاسی منظر پر سامنے آ چکے تھے۔ یلسن نے عوامی طاقت کے سہارے سے گورباچوف کو رہا کروا کر دوبارہ صدر بنوا دیا۔ بغاوت ناکام ہوگئی۔ روس کے وزیر داخلہ بورس یوگر نے خودکشی کر لی۔ بعد میں بورس یلسن نے اقتدار مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں لے کر USSR کی تنسیخ کر ڈالی اور ایک مضبوط فیڈریشن کی بجائے لچک دار اور ڈھیلی ڈھالی فیڈریشن کی بنیاد ڈالی۔ اس فیصلے سے اقتدار اب روس کی مرکزی حکومت کی بجائے فیڈریشن کی ریاستوں کے پاس منتقل ہو گیا۔ اس سلسلے کو بتدریج آگے بڑھایا گیا۔ ۲۵ دسمبر کو میخائل گورباچوف روس کے پہلے اور آخری ایگزیکٹو صدر رہنے کے بعد مستعفی ہو گئے۔ اس طرح روس کے قتدار کی کنجیاں نئے جمہوریت پسند صدر بورس یلسن کے ہاتھ آ گئیں۔ گیارہ سابقہ روسی ریاستوں نے ایک معاہدہ پر دستخط کر کے روس کے تسلط سے آزادی حاصل کر لی۔ اس طرح سوویت یونین نے جو غلطی افغانستان پر حملہ کر کے کی تھی، وہ اس کے ٹکڑے کر کے اختتام کو پہنچی اور اس طرح پچھلی صدی میں برطانیہ کے بعد ایک اور عظیم طاقت کے تسلط سے لوگوں کو آزادی ملی۔

دوسری طرف افغانستان بھی حالات ابتر ہو رہے تھے۔ کیونکہ ہر بڑے گروپ نے اپنی اپنی افواج تشکیل دے رکھی تھیں اور مختلف صوبوں کو مختلف ممالک کی حمایت حاصل تھی۔ جو دونوں طرح سے جاری تھی۔ یعنی مالی اور سیاسی۔ جنگ کے بعد ہر گروپ کے پاس بھاری اسلحہ تھا۔ جس کی وجہ سے اکثر یہ لوگ آپس میں لڑنے میں مصروف رہتے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ گروپوں نے روس سے بھی روابط بڑھا لئے اور روس سے اسلحہ بھی لینا شروع کر دیا۔ اس طرح ایک ہی ملک میں بہت سے گروپوں میں لڑائی کا خطرہ بڑھنے لگا۔

اسی دوران اپریل 1992ء میں نجیب اللہ کو بالآخر اقتدار سے ہٹا دیا گیا۔ اس میں سب سے اہم کردار جنرل عبدالرشید دوستم نے ادا کیا اور وفاداری بدلتے ہوئے اپنی ازبک ملیشیا کو اسے ہٹانے کے لیے استعمال کیا۔ نجیب اللہ نے اقوام متحدہ کے کمپاؤنڈ میں پناہ لی۔ جہاں وہ اگلے چار برس عملاً قیدی کے طور پر رہا۔ اس طرح تمام دھڑوں نے مل کر ایک عبوری حکومت بنانے کا فیصلہ کیا مگر حزب اسلامی کے

سربراہ حکمت یار نے اس میں شرکت سے صاف انکار کر دیا۔ معاہدہ پشاور کے بعد بننے والی حکومت کے تحت جون میں برہان الدین ربانی کو افغانستان کی اسلامی ریاست کا صدر مقرر کر دیا گیا۔ اس کے صرف ایک ماہ بعد افغان دھڑوں میں کی باہمی جنگ چھڑ گئی۔ جس کے نتیجے میں افغانستان پھر قتل و غارت کی لپیٹ میں آ گیا۔ حکومت کا سربراہ بھی کسی نہ کسی دھڑے سے تعلق رکھتا جس کے نتیجے میں دوسروں کے لیے اس کو قبول کرنا مشکل تھا۔ اس کے بعد ایک اور بڑی تبدیلی تب آئی جب جون 1993ء میں گلبدین حکمت یار کو وزیراعظم مقرر کر دیا گیا جس پر اس کا سخت دشمن احمد شاہ مسعود وزیر دفاع سے مستعفی ہو گیا۔ جس کی وجہ سے لڑائی دوبارہ چھڑ گئی جو جنوری 1996ء میں شدید ہو گئی۔ جب جنرل عبدالرشید دوستم نے حکمت یار سے اتحاد کر لیا۔ اس کے کنٹرل میں شمالی افغانستان کا وسیع علاقہ تھا۔ حکمت یار نے وزارت عظمیٰ چھوٹ کر پھر ہتھیار اٹھا لئے تھے۔ ان تمام گروپوں کی آپس کی لڑائی نے لوگوں کے ذہنوں کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ تمام کاروبار زندگی ختم ہو کر رہ گئے۔ آخر کار ان تمام لڑائیوں کے دامن سے ایک ایسے گروپ نے جنم لیا جو امن کی علامت بن کر سامنے آئے۔ وہ اکتوبر 1996ء میں اچانک نمودار ہوئے جبکہ وہ تب ایک غیر معروف گروپ تھا۔ ملا محمد عمر کی قیادت میں انہوں نے قندھار اور اس سے ملحقہ علاقے پر قبضہ کر لیا اور ان کی فتوحات کا سلسلہ یہیں نہ رکا بلکہ اگلے سال کے شروع میں انہوں نے مشرقی افغانستان پر حملہ کیا اور جلال آباد پر اور 27 ستمبر کو کابل پر بھی قابض ہو گئے۔ یہ ان کی بہت بڑی کامیابی تھی جو انہوں نے بڑے بڑے جنگجوؤں کے خلاف حاصل کی تھی۔ کابل پر قابض ہونے کے بعد انہوں نے نجیب اللہ کو اقوام متحدہ کے متروک کمپاؤنڈ سے گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ 24 مئی 1997ء کو طالبان نے مزار شریف پر قبضہ کر لیا۔ دوسری طرف جنرل رشید دوستم اپنے ایک کمانڈر عبدالمالک پہلوان کے منحرف ہونے کے بعد ترکی فرار ہو چکا تھا۔ اگلے دن ہی پاکستان، سعودی عرب اور عرب امارات نے طالبان کی حکومت کو تسلیم [illegible] ہم جیسا کہ افغانستان کی تاریخ ہے، اس کے مطابق ہی 28 مئی کو پہلوان نے اپنی وفاداری پھر تبدیل کر لی اور حکمت یار سے اتحاد کر کے شدید جنگ کے بعد طالبان کو مزار شریف سے نکال دیا۔ اس خونخوار جنگ میں بہت سے طالبان شہید ہوئے۔

جولائی کے مہینے میں طالبان مخالف حکومت مزار شریف میں تشکیل پائی۔ برہان الدین ربانی اس کا صدر، عبدالرشید غفورزئی وزیراعظم، احمد شاہ مسعود وزیر دفاع اور عبدالمالک پہلوان وزیر خارجہ بن گیا۔ اس طرح اقتدار کی خاطر ہزاروں لوگوں کو ہلاک کروانے والے یہ تمام لوگ اکٹھے ہو گئے۔ سب سے

پہلے یہ لوگ روس کے خلاف جنگ لڑتے رہے۔ جب ملک سے ان کا تسلط ختم ہوا تو تاریخ کو دہراتے ہوئے انہوں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا اور جب افغانستان کے ہی چند باشندوں نے ان کے خلاف حق کی جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا تو یہ تمام دھڑے دوبارہ اکٹھے ہو گئے اور پھر حالت جنگ میں آ گئے۔

حکومت کی تشکیل کے بعد پہلوان اور احمد شاہ مسعود کی فوجوں نے ہزارہ جات ملیشیا سے مل کر طالبان کو کابل کی طرف دھکیل دیا۔ طالبان نے ستمبر میں مزار شریف پر پھر حملہ کیا مگر ناکام رہے۔ مختصر یہ کہ 1997ء تک افغانستان پر عملاً دو حکومتیں قائم ہو چکی تھیں۔ ایک طالبان کی جو پشتون اکثریت والے جنوبی علاقے پر، جس میں دارالخلافہ کابل بھی شامل تھا، حکومت کر رہے تھے۔ دوسری طرف شمالی اتحاد کی نام نہاد حکومت تھی، جو شمال میں تاجک، ازبک، ترکمانستان اور ہزارہ علاقوں پر حکمران تھے۔

طالبان نے ملک کو لاقانونیت اور کرپشن سے نجات دلانے کا عہد کیا تھا۔ ان کی حکومت پر لوگوں نے بے حد اعتماد کیا ور طالبان نے بھی ان کے اس اعتماد کی لاج رکھتے ہوئے ملک پر صحیح معنوں میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی۔ جنگجوؤں سے ہتھیار اکٹھے کر لیے گئے جس کی وجہ سے ملک میں کئی سالوں بعد امن و سلامتی دیکھنے میں آئی۔ ملک میں اسلامی سزاؤں کے نفاذ سے معاشرتی برائیوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ جس کی وجہ سے ملک میں خوشحالی کی ہلکی سی کرن نے جنم لیا۔ چونکہ یہ ایک خالص اسلامی حکومت تھی اس لیے انہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو درپیش چیلنجوں کے خلاف حیثیت کے مطابق آواز بلند کی اور مسلمانوں کا ساتھ دیا جس کی بڑی مثال اسامہ بن لادن ہیں۔

اسامہ بن لادن ایک مالدار سعودی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ دوران جنگ روس کے خلاف اس جہاد میں خود بھی شریک ہوئے۔ اس کے علاوہ وہ مجاہدین کی بھرتی کرنے اور ان کے لیے فنڈ اکٹھے کرنے میں سب سے آگے تھے۔ سوویت یونین کی فوجوں کی واپسی پر انہوں نے ایک تنظیم بنائی تاکہ پاکستان میں موجود سینکڑوں غیر ملکی مجاہدین کی مدد کی جا سکے۔ دوسری طرف پاکستان ان مجاہدین کو اپنے اپنے ملک بھیجنے کی فکر میں مبتلا تھا۔ پاکستان نے امریکہ کے ذریعے سعودی عرب اور خلیج فارس کے دیگر ممالک سے رابطہ کیا اور دباؤ ڈالا کہ وہ ان مجاہدین کو پاسپورٹ دے۔ انہیں مختلف مقامات سے ان کے وطن پہنچایا گیا۔ 1900 ایسے مجاہدین الجزائر پہنچے جہاں انہوں نے اسلامی آرمی گروپ جی آئی اے بنایا جس نے 1990 کے بعد سے ملک میں کفر کی طاقتوں کے خلاف۔ باقاعدہ جہاد کا اعلان کیا۔ کچھ بوسنیا چلے گئے اور سرب فوج سے لڑنے وا۔ مسلمانوں میں شامل ہو گئے۔ کچھ لبنان، آذربائیجان اور

بوسنیا چلے گئے جس کا دارالحکومت گروزنی مجاہدین کا ٹرانزٹ پوائنٹ بن گیا۔ عبدالرسول سیاف کی اتحاد اسلامی کے افراد فلپائن پہنچ گئے۔

اسامہ بن لادن جب افغانستان کے جہاد سے واپس سعودی عرب پہنچے تو سی آئی اے کی خواہش کے مطابق عراق نے پہلے ایران کے خلاف جنگ کا اعلان کیا اور آٹھ سال تک یہ خوفناک جنگ جاری رہی۔ امریکہ کو اس جنگ سے مطلوبہ اہداف پورے نہ ہو سکے، جس کے بعد انہوں نے عراق کو کویت پر حملہ کرنے اور خود غیر جانبدار رہنے کا وعدہ عراق سے کیا، جس کا ثبوت آج بھی تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ مگر حملے کے بعد بڑی چالاکی سے اس نے عرب ممالک پر اپنا تسلط قائم کر لیا اور ہر ملک کو تحفظ دینے کی آڑ میں وہاں کے وسائل پر قابض ہو گیا، جو اس کا بڑا ٹارگٹ تھا۔ 1991ء میں اسامہ بن لادن اپنے وطن لوٹ گیا۔ جہاں اسے سعودی سرزمین پر مغربی افواج کی موجودگی کے مخالفین میں نمایاں حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ وہ حرمین الشریفین سے امریکیوں کے ناپاک قدم نکال کر ہی دم لے گا۔ وہ غیر ملکی فوجوں کو عالم اسلام سے نکل جانے کے لیے کہہ رہے تھے، مسلم دنیا کی ساری دولت بزدل مسلمان حکمرانوں کو بلیک میل کر کے اور ڈرا دھمکا کر امریکی ہڑپ کر رہے ہیں۔ امریکہ جونک کی طرح جسد اسلامی سے خون چوس رہا ہے۔ اسامہ بن لادن کے علاوہ سعودی عرب کے مقتدر مذہبی حلقے بھی امریکی فوج کی سعودی عرب آمد کے سخت خلاف تھے۔ ان کا ایک اور موثر اور مضبوط نقطۂ نظر یہ ہے کہ امریکہ عرب ممالک کے تیل کے ذخائر پر ناجائز قبضہ کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔

73ء کے بعد سے دنیا میں ہر شے کی قیمت بڑھی ہے لیکن پیٹرول اس حساب سے مہنگا نہیں ہوا۔ 73ء سے اب تک پیٹرول کی قیمت میں صرف 10 ڈالر فی بیرل اضافہ ہوا ہے۔ جبکہ دیگر اشیاء تین گنا مہنگی ہو گئیں۔ تیل بھی اتنا مہنگا ہونا چاہئے تھا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ امریکی گندم تین گنا مہنگی ہوئی لیکن عربوں کا تیل 24 سال بعد بھی چند ڈالر سے زیادہ مہنگا نہیں ہو سکا۔ کیونکہ امریکہ کی بندوق عربوں کی پیشانی پر ہے۔ ہم روزانہ فی بیرل 155 ڈالر کا نقصان اٹھا رہے ہیں۔ صرف سعودی عرب میں 10 ملین بیرل تیل نکلتا ہے۔ روزانہ کا خسارہ ایک ارب ڈالر سے زیادہ ہے۔ ان کا مزید کہنا ہے کہ پچھلے گیارہ برس میں امریکہ نے ہمیں گیارہ کھرب ڈالر کا نقصان پہنچایا۔ یہ بھاری رقم امریکہ سے وصول کرنا بہت ضروری ہے۔ دنیا بھر میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ایک ارب ہے۔ اس رقم سے ہر مسلمان خاندان کو 10 ہزار ڈالر تقسیم ہوں گے تو گیارہ کھرب ڈالر پورے ہوں گے۔

اس سلسلے میں اسامہ بن لادن نے سعودی حکومت کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ جس کے نتیجے میں انہیں سعودی عرب سے کہیں اور منتقل ہونا پڑا۔ اور وہ سوڈان چلے گئے۔ ان کے ہمراہ سینکڑوں عرب مجاہدین بھی تھے۔ اسامہ بن لان نے ان مجاہدین کو اپنے کاروبار میں روزگار دینا شروع کر دیا۔ سوڈان کے دارالحکومت خرطوم میں دریائے نیل کے کنارے اسامہ بن لادن کے بڑے بڑے زرعی فارم تھے۔ اسامہ وہاں سے حاصل ہونے والی آمدنی سوڈانی مسلمانوں پر ہی خرچ کرتے تھے۔ جب سوڈان کے مسلمانوں کی ہمدردیاں اسامہ کیساتھ بڑھنے لگیں تو امریکہ اور مغربی میڈیا نے اسامہ کے خلاف پراپیگنڈہ تیز کر دیا۔ اسامہ پر الزام لگایا جانے لگا کہ اس نے دریائے نیل کے کنارے دہشت گردوں کی تربیت کے لیے کیمپ قائم کر رکھے ہیں۔ اس سلسلے میں سوڈان کی حکومت پر دباؤ ڈالا گیا کہ اسامہ کو سوڈان سے نکال دیا جائے۔ اسامہ بن لادن ایک بار پھر افغانستان کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسی دوران امریکہ میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں بم دھماکہ اور سعودی عرب میں امریکیوں پر حملہ کے الزامات بھی اسامہ کے حصہ میں آئے۔ جس کے بعد امریکہ کے دباؤ پر اسامہ کی سعودی شہریت معطل کر دی گئی۔ انہوں نے افغانستان کو اپنا ٹھکانہ بنایا جہاں سے انہوں نے مجاہدین مظلوم مسلمانوں کی مدد کے لیے بھیجے۔ مسلمان مجاہدین کے بوسنیا پہنچتے ہی جنگ کا پانسا مسلمانوں کے حق میں پلٹنا شروع ہو گیا۔ امریکی انٹیلی جنس اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ 1993ء میں نیویارک میں واقع ورلڈ ٹریڈ سینٹر، 1995ء میں ریاض میں ہونے والے کار بم دھماکے جس میں پانچ امریکی ہلاک ہو گئے تھے اور 1996ء میں الخبر ملٹری بیرکس میں ٹرک میں ہونے والے بم دھماکہ میں 19 امریکی ہلاک ہوئے تھے، ان کا ذمہ دار اسامہ بن لادن تھا۔ ان تمام حقائق کے بعد امریکہ نے اسامہ بن لادن کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا جو ایک بڑے آپریشن کی شکل میں 97-1996ء میں ہوا، جسے پاکستان اور امریکہ نے خفیہ رکھا۔ امریکی کمانڈوز جن کی تعداد ۷ تھی، جبکہ انہیں ۷ کے قریب ایف بی آئی کے اہلکار جدید سیٹلائٹ سسٹم کے ذریعے واچ کر رہے تھے اور ہدایات دے رہے تھے، اس آپریشن میں اسامہ بن لادن کے جانثار ساتھیوں اور امریکی کمانڈوز میں مڈبھیڑ ہو گئی، لیکن امریکہ کا یہ آپریشن بری طرح ناکام رہا۔ ذرائع کا دعویٰ ہے کہ اس آپریشن میں پانچ امریکی کمانڈوز گرفتار ہو گئے تھے جبکہ ۱۲ ہلاک ہو گئے تھے۔ بعد ازاں گرفتار ہونے والے پانچ کمانڈوز کو پاکستانی حکومت کی کوششوں سے رہا کر کے امریکہ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس آپریشن میں ناکامی کے بعد امریکہ نے فیصلہ کیا کہ جب تک کوئی مخبر یا ضمیر فروش تلاش نہیں کر لیا جاتا،

اس وقت تک اسامہ بن لادن کے خلاف صحیح نشانے پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا۔ اسامہ بن لادن کا وجود نہ صرف افغانستان میں خطرناک تھا بلکہ تمام مشرق وسطیٰ میں اس کے مفادات کے خطرے میں پڑ گئے۔

افغانستان دو مزید غیر مسلم مملکتوں کے لیے بھی بڑا خطرہ بن چکا تھا، جن میں اسرائیل اور بھارت شامل ہیں۔ افغانستان سے مجاہدین تربیت لے کر ان دونوں محاذوں پر جا کر لڑتے تھے۔ جب ان کی کارروائیاں کامیابی کی طرف قدم بڑھانے لگیں تو امریکہ سمیت ان دونوں ممالک نے افغانستان کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا۔

اس کے نتیجے میں امریکہ کے ذریعے پاکستان پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ افغانستان سے اسامہ کے متعلق بات چیت کرے۔ جس کے نتیجے میں اکتوبر 1999ء میں طالبان مجاہدین کے تربیتی کیمپ ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے بڑی تعداد میں مجاہدین پاکستان بھیج دیئے۔ یہ واقعہ اس وقت کے آئی ایس آئی کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل خواجہ ضیاالدین کے دورہ افغانستان کے بعد ہوا جس نے وہاں طالبان لیڈر ملا عمر سے پاکستانی وزیراعظم میاں محمد نواز شریف کے ایما پر ملاقات کی تھی۔ تاہم طالبان نے اسامہ بن لادن کو اقوام متحدہ کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ جن پر امریکہ میں مقدمہ چلایا جانا تھا۔ اس پر امریکہ نے افغانستان پر پابندیاں لگا دیں۔ اس کے تحت طالبان کے سمندر پار اثاثے اور افغان ایئر لائن آریانا کے امریکہ میں 450 ملین ڈالر کے اثاثے منجمد کر دیئے۔ اس کے بعد کابل اور اسلام آباد میں ہنگامے ہوئے اور اقوام متحدہ کے دفاتر پر حملہ کیا گیا۔

اس کے بعد حالات میں مزید سنگینی آتی گئی۔ جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسرائیل نے گیارہ ستمبر جیسے حملے کی منصوبہ بندی کرنا شروع کر دی۔ اس طرح ان کا مقصد تھا کہ تمام دنیا کی نظریں مسلمانوں پر ہوں گی اور وہ اپنے مقاصد کے لیے مظلوم فلسطینیوں پر ظلم جاری رکھے گا۔ اور آخر کار وہ اس منصوبہ بندی میں کامیاب ہوئے اور یہ گیارہ ستمبر 2001ء کو پونے نو بجے امریکن ایئر لائن کا ایک بوئنگ 767 مسافر طیارہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر نیو یارک کے 1368 فٹ فٹ اونچے شمالی ٹاور سے جا ٹکرایا۔ یہ منظر دیکھنے والوں نے اسے ایک خوفناک حادثہ تصور کیا لیکن گیارہ منٹ بعد آٹھ بج کر 56 منٹ پر یہ خیال باطل ہو گیا۔ امریکہ اور دنیا بھر میں کروڑوں جو ٹی وی دیکھ رہے تھے کی نظروں کے سامنے ایک اور بوئنگ 767 طیارہ جو یونائیڈ ایئر لائنز کا تھا اڑتا ہوا جنوبی ٹاور میں گھس گیا۔ خوفزدہ لوگوں کے سامنے دونوں ٹاوروں کی بالائی منزلیں شعلوں اور دھوئیں میں چھپ گئیں۔ 10 بج کر 67 منٹ پر جنوبی ٹاور زمین بوس ہو

گیا۔20 منٹ بعد شمالی ٹاور بھی گر گیا۔ ہزاروں افراد ہلاک ہو گئے۔کئی افراد نے ڈر کے مارے چھلانگیں لگا دیں۔ جس کی وجہ سے وہ ہلاک ہو گئے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے دو ٹاورز والی دونوں عمارتوں میں سے ہر ایک 100 منزلوں کی تھی اور یہ 1368 فٹ بلند تھی۔ ہر عمارت 64 مربع میٹرز پر پھیلی ہوئی تھی۔ دنیا کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھی، اور عمارت میں 21 ہزار 8 سو بڑے شیشوں والی کھڑکیاں اور تیزی سے چلنے والی 23 قدرے سست رفتار والی 72 لفٹیں اور خودکار سیڑھیاں لگی ہوئی تھیں اور عمارت میں تقریباً 50 ہزار افراد کام کیا کرتے تھے۔ اس عمارت کی 107 ویں منزل پر پورا نیویارک دیکھا جاسکتا تھا اور اس میں مرکزی نمائش ہال تھے۔ جو اس قدر بڑے تھے کہ ان میں پندرہ فٹ بال سٹیڈیم سما سکتے تھے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں دکانوں اور دفاتر کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ اس میں ہر قسم کے دفاتر یا دکانوں کی کم از کم تعداد تقریباً ڈیڑھ ہزار اور زیادہ سے زیادہ تقریباً نو ہزار تھی۔ مثلاً اس میں اکاؤنٹنگ اینڈ آڈٹ بک شاپس کی تعداد 8721، بک سٹورز 5442، رسائل و جرائد کی شاپس 5192، کمپیوٹر کے مختلف شعبوں کے دفاتر کی تعداد 25 ہزار سے زائد، ہوٹل اینڈ موٹلز 7011، جیولری 5944، شراب کی دکانیں 5921، عدالتیں 9211، ٹیلی کمیونیکشن 5088، ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے دو ٹاورز میں سے جس ٹاور کیساتھ جہاز پہلے ٹکرایا، وہ بعد میں گرا جبکہ جس ٹاور کیساتھ بعد میں جہاز ٹکرایا وہ پہلے گر گیا۔ ایک ٹاور جہاز ٹکرانے کے 50 منٹ بعد اور دوسرا 68 منٹ بعد گرا۔

ابھی لوگ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے حملے میں مبتلا تھے کہ واشنگٹن میں دریائے پوٹامک کے پار ایک تیسرا واشنگٹن میں دریائے امریکن ایئر لائنز 757 طیارہ نو بج کر 38 منٹ پر پینٹاگون کی مغربی دیوار سے ٹکرایا۔ عمارت کی کنکریٹ سے بنی ہوئی پانچ میں سے تین دیواروں کے اندر گھس گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں عمارت کا ایک حصہ گر کر تباہ ہو گیا تھا۔ 58 مسافروں اور عملہ کے چھ افراد سمیت 90 افراد ہلاک ہو گئے۔ اس وقت ایف بی آئی کو پتہ چلا کہ 20 منٹ پہلے یونائیٹڈ ایئر لائنز کی پرواز یو اے 093 نیویارک سے سان فرانسسکو جاتے ہوئے ٹپس برگ کے قریب گر کر تباہ ہو گئی تھی۔ جسے امریکن لڑاکا طیاروں نے وارننگ کے بعد مار گرایا۔

اس حملے نے پوری دنیا کو ایک خوفناک لپیٹ میں لے لیا اور ہر کوئی اس خوف میں مبتلا تھا کہ اب امریکہ جانے کس کے خلاف کارروائی کا آغاز کر دے مگر حسب توقع اس حادثے کی مکمل ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی گئی۔ جب کہ اس حادثے کے پس منظر کے حقائق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ

اس حملے میں اسرائیل کی انٹیلی جنس ایجنسی ''موساد'' ملوث ہے۔ اس کے علاوہ اتنے بڑے پیمانے پر تباہی اور وہ بھی امریکہ جیسے ملک میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ امریکہ میں ہر سال سیکیورٹی پر کئی بلین ڈالر خرچ کئے جاتے ہیں اور سیکیورٹی کے جدید آلات سے امریکی سیکیورٹی کے اہلکاروں کو پل پل کی خبر ہوتی ہے۔

گیارہ ستمبر کے حملوں کے فوراً بعد تمام دنیا کے ٹیلیوژنوں کی سکرینوں پر ایک ہی شخص کی تصویر بار بار دکھائی جا رہی تھی اور وہ تھے اسامہ بن لادن۔ چونکہ مغربی میڈیا پر زیادہ تر کنٹرول یہودیوں کا ہے، اس لیے انہوں نے اس کو خوب اچھی طرح اسامہ اور مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا۔ امریکہ کے سابق وزیر خارجہ ہنری کسنجر جو خود بھی یہودی ہیں، نے حملے کے فوراً بعد ایک بیان دیا، جس میں انہوں نے مسلمانوں اور اسامہ کو اس حملے کا ذمہ دار قرار دیا۔ مگر دوسری طرف کچھ باخبر حلقے ایسے بھی تھے جن کے اوسان ابھی تک خطا نہیں ہوئے تھے اور وہ اس ''میمو'' (Memo) پر غور کر رہے تھے جو گیارہ ستمبر سے ٹھیک چار ماہ پہلے سی آئی اے کے اندرونی حلقوں میں تقسیم کیا گیا تھا کہ اسرائیلی انٹیلی جنس موساد امریکہ کیخلاف ایک خطرناک خفیہ آپریشن کا منصوبہ بنا رہی ہے تا کہ دنیا بھر خصوصاً امریکی اور یورپی میڈیا کی نظریں اسرائیل سے فلسطین میں وحشیانہ مظالم سے ہٹا کر فلسطینیوں کے خلاف رائے عامہ ہموار کی جا سکے اور اس وقت نفرت کا فائدہ اٹھا کر اسرائیلی فوج کو بے گناہ فلسطینیوں کے ایسے کھلے قتل عام کا موقعہ مل جائے جس کا گھناؤنا خواب وہ ایک عرصے سے دیکھ رہے تھے۔ گیارہ ستمبر کے حملے کے فوراً بعد سی آئی اے کے ماہرین نے اپنا سر پیٹ لیا اور ان کی تحقیقات نے اس خدشے کو حقیقت ثابت کر دیا کہ سی آئی اے کے تمام ذرائع اس بات پر متفق تھے کہ جس نوعیت کا حملہ کیا گیا ہے، اس کے لیے جس نوعیت کی اعلیٰ ترین منصوبہ بندی کی گئی ہے، وہ کسی ایڈوانس انٹیلی جنس ایجنسی کا کارنامہ ہو سکتا ہے۔ جبکہ کسی مسلمان ملک میں انٹیلی جنس کا اس سطح تک ہونا ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ دنیا بھر کے ماہرین انٹیلی جنس اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ''موساد'' کا امریکی انٹیلی جنس سسٹم میں کتنا عمل دخل ہے۔ کچھ بھی ان کی رسائی سے باہر نہیں۔ گیارہ ستمبر کے حملوں کے بعد اسرائیل اور عالمی صیہونی مفادات کو زبردست تقویت ملی۔ اسرائیل کے ایجنٹ امریکہ سمیت دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ تمام امریکی ایجنسیوں اور اداروں میں موساد کے کارکن موجود ہیں۔ ہر اسرائیلی کے پاس امریکی شہریت بھی ہے اور ہر امریکی یہودی اسرائیلی شہریت کا حامل ہے۔ اس طرح یہودیوں کی رسائی امریکہ کے حساس اداروں تک بھی آسان ہو جاتی

ہے۔ یہودیوں کے ان حملوں میں ملوث ہونے کی ایک دلیل امریکہ کے مصنف اور محقق سیمور ہیرش نے 18 کتوبر 2001ء میں امریکی جریدے ''نیویارکر'' میں ایک مقالہ شائع کروایا جس میں انہوں نے کہا کہ ''امریکی ایف بی آئی اور دیگر تحقیقی ادارے اصل حقائق سے ہٹ کر تحقیق کر رہے ہیں جس میں عربوں کو جان بوجھ کر ملوث کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس قسم کی کارروائیوں نے امریکیوں کی زندگیاں اسرائیلیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دی ہیں۔ بلکہ تشدد اور بنیاد پرست یہودی مغرب میں رہنے والے یہودیوں کو بھی قتل کرنے سے دریغ نہیں کریں گے کیونکہ ان کے خیال میں امریکہ اور دیگر مغربی ممالک میں مقیم یہودی اصل یہودی تشخص کے خلاف ہیں۔'' جہاں ان حملوں نے یہودیوں کو اور بڑے فوائد پہنچائے۔ وہاں ایک یہ بھی ہے کہ اسرائیلیوں کو امریکہ کی جانب بڑی تعداد میں ہجرت سے روکا جا سکے۔ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کو اصل یہودی تشخص کی حفاظت کے لیے ضروری سمجھا گیا تھا۔ گیارہ ستمبر سے پہلے اسرائیل میں اس قسم کے خیالات پروان چڑھ رہے تھے کہ فلسطین کی تحریک انتفاضہ کی وجہ سے اسرائیلی اپنے آپ کو اسرائیل میں محفوظ نہیں سمجھتے تھے جبکہ ان کے مطابق امریکہ دنیا میں سب سے امن وامان والا علاقہ ہے۔ ایک سروے کے مطابق 37 فیصد اسرائیلی جسے اسرائیل کا دولت مند طبقہ قرار دیا جاتا ہے، ان میں سے بڑی تعداد فوراً اسرائیل چھوڑ کر امریکہ میں آباد ہونے کے منصوبے ترتیب دے رہی تھی۔ مگر گیارہ ستمبر کے واقعات کے بعد اس پروان چڑھتے فکر کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پینٹاگان پر حملے کے بارے میں جو مختلف ذرائع سے دنیا کے سامنے آ رہے ہیں، اس کے مطابق اسرائیلیوں نے تباہی کے خوف سے اب امریکہ جانے کا ارادہ بھی ملتوی کر دیا۔ ان تمام حقائق کے باوجود امریکہ نے اس طرف توجہ نہ دی۔ کیونکہ وہ مسلم ممالک پر تسلط کا اپنا پرانا خواب پورا کرنے کا خواہاں تھا۔ دوسری طرف امریکہ نے افغانستان پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ اسامہ کو زندہ یا مردہ اس کے حوالے کر دے۔ جس کے بعد دونوں ملکوں میں اجلاس ہونے جس میں مستقبل قریب کا مشکل ترین فیصلہ کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ اسی دوران امریکہ نے جہاں پوری دنیا کی ہمدردیاں سمیٹنے کے لیے دفتر خارجہ کے وفود دوسرے ممالک بھیجے۔ وہاں پاکستان کی اہمیت کو بھانپتے ہوئے ان سے مسلسل رابطوں میں تھا۔ انہی دنوں میں بین الاقوامی میڈیا کے ذرائع خبر دے رہے تھے کہ امریکہ پاکستان سے بھی اہم نکات منوانا چاہتا ہے۔

1...... پاکستان افغانستان کیساتھ اپنی سرحد سیل کر دے۔

2...... طالبان کو ایندھن کی سپلائی بند کر دے۔

3...... پاکستان کی فضائی حدود کو امریکی جنگی طیاروں کے لیے جائز قرار دیا جائے۔
اس کے ساتھ یہ خبر بھی آئی کہ امریکی اپنے مطالبے منظور ہونے کی صورت میں پاکستان کو فوراً تین ارب ڈالر قرض دے گا۔ دوسری جانب امریکی وزیر خارجہ کولن پاول بھی یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ پاکستان امریکہ کا مکمل ساتھ دے اور طالبان کی حمایت ترک کر دے۔ اس کے جواب میں پاکستان کی حکومت نے امریکیوں کو شروع میں ہی واضح کر دیا تھا کہ امریکہ کی یہ توقع بالکل غیر فطری ہوگی کہ پاکستان کی فوج افغانستان کے خلاف کسی فوجی کارروائی میں امریکہ کے ساتھ ہوگی۔ اس کے علاوہ پاکستان اقوام متحدہ اور بین الاقوامی اتحاد کی کسی بھی تجویز کا مثبت جواب دے گا۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان افغانستان کو ہر طرح کی سپلائز بند کرنے کو تیار ہے مگر 1400 میل لمبی پاک افغان سرحد سیل کر کے پابندیاں عائد کرنا ناممکن ہوگا۔ اس کے بعد طالبان نے ایک بیان میں کہا کہ ان کے خلاف جس ہمسایہ ملک خصوصاً مسلم ممالک نے امریکہ کے حملے میں مدد کی، طالبان اس کو معاف نہیں کریں گے اور اپنا دشمن تصور کریں گے۔
اس کے علاوہ امریکہ میں موجود آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل محمود کے مذاکرات امریکی حکومت سے جاری تھے اور امریکی سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی کے سربراہ سینٹر یا ہیڈن نے جنرل محمود سے ملاقات میں ان کو وارننگ دی کہ وہ دو میں سے ایک راستے کا انتخاب کر لیں یا ہمارے دوست یا پھر دشمن؟
حالات میں تیزی سے تبدیلی آ رہی تھی اور لحہ بہ لحہ ہونے والی تبدیلی جس طرح ساری دنیا پر اثر انداز ہو رہی تھی، اس سے پاکستان سب سے زیادہ متاثر ہو رہا تھا۔ جنرل مشرف کی قیادت میں اعلیٰ فوجی قیادت اور کابینہ کے ساتھ پہلے ہی یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ پاکستان امریکہ کی ہر طرح سے امداد کرے گا۔ پاکستانی حکومت نے طالبان سے رابطہ کیا اور ان سے اصرار کیا کہ وہ اسامہ کو امریکہ کے حوالے کر کے افغانستان اور اپنی حکومت کو بچا سکتے ہیں۔ طالبان نے اپنی شوریٰ میں غور و فکر کے بعد پاکستانی حکومت سے کہا کہ ملا عمر نے علمائے کرام کا اجتماع کیا ہے اور علمائے کرام سے مشاورت کے بعد ہی کوئی فیصلہ ہوگا کہ اسامہ کو امریکہ کے حوالے کیا جائے یا نہیں؟ یہ اجلاس 18 ستمبر سے 20 ستمبر تک جاری رہا جس میں کوئی واضح صورت حال سامنے نہ آ سکی۔ اس اجلاس میں ان شرائط کی فہرست بھی تیار کی جا رہی تھی جو اسامہ کو کسی تیسرے ملک کے حوالے کئے جانے کی صورت میں امریکہ کے سامنے رکھی جائیں گی۔

افغان عوام میں ایک خوف کی لہر دوڑ گئی۔ بعض لوگ خوش بھی تھے مگر ان کی تعداد بہت کم تھی۔ بہت سے لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر دور دراز کے علاقوں میں منتقل ہو رہے تھے۔ قندھار شہر جہاں اسامہ بن لادن کا مکان تھا، اس وقت بھوتوں کا شہر بن چکا تھا۔ 75 فیصد افغان شہر کو خالی کر چکے تھے۔ اور باقی افراد بھی ممکنہ امریکی بمباری سے خائف تھے۔ کیونکہ اگر بمباری ہوئی تو سب سے زیادہ نشانہ کابل اور قندھار نے بننا تھا۔

مجلس شوریٰ کے بیشتر علماء امریکہ کے خلاف جہاد جاری رکھنے پر زور دے رہے تھے اور اسامہ کو امریکہ یا کسی تیسرے ملک کے حوالے کرنے سے بھی صاف انکاری تھے۔ دوسری طرف طالبان کے سربراہ ملا محمد عمر نے کہا کہ اسامہ بن لادن کو بغیر ثبوت کے کسی کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ انہوں نے اسامہ کے خلاف امریکی الزامات کو اسلام کے خلاف جنگ کرنے کا ایک بہانہ قرار دیا۔ انہوں نے اسامہ بن لادن کو امریکہ پر حالیہ حملوں میں بے قصور قرار دیا۔

انہوں نے کہا کہ امریکہ ہمیں ختم کرنے کے لیے مختلف بہانے ڈھونڈ رہا ہے۔ اسلام زندگی کا بہترین اور حقیقی راستہ ہے اور ہمارے دشمن ہمارے مذہب کے خلاف ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے دشمن ہیں۔ امریکہ ہماری تجاویز اور مطالبات پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں تو وہ کس طرح ہم سے توقع رکھتا ہے کہ ہم اپنے مہمان اسامہ کو بے دخل کر دیں گے۔

انہوں نے مزید کہا کہ غیور افغان قوم نے برطانوی اور روسی افواج کو سبق سکھایا اور امریکہ بھی اپنے انجام سے باخبر رہے۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ اسامہ بن لادن کو حوالے کرنے کے معاملے میں تحمل سے کام لے اور صورت حال کو خراب ہونے سے بچائے۔ امریکہ کو چاہئے کہ وہ دہشت گردی کے واقعات کے قصوروار افراد کے بارے میں مکمل اطلاعات فراہم کرے۔ ہم تمام دنیا کو یقین دلاتے ہیں کہ اسامہ یا کوئی بھی شخص افغانستان کی سرزمین کو کسی بھی دوسرے ملک کے خلاف استعمال نہیں کر سکتا۔ تاہم ملا عمر نے کہا کہ ہم اسامہ پر امریکہ سے مذاکرات کے لیے تیار ہیں۔

اس بیان کا امریکیوں نے سخت نوٹس لیا اور امریکی صدر بش نے طالبان کو وارننگ جاری کی کہ وہ اسامہ کو فوراً امریکہ کے حوالے کر دیں۔ یہ مذاکرات کا نہیں، عمل کا وقت ہے اور طالبان کو اس مسئلے پر اب مزید مہلت نہیں دی جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی امریکی فوجوں نے باقاعدہ تیاریوں کا آغاز کر دیا اور طالبان نے بھی اپنے وسائل کے مطابق اپنی تیاریاں مکمل کرنی شروع کر دیں۔

دوسری طرف برطانوی لڑاکا طیارے بھی سویز کنال سے گزر کر خلیج کی طرف بڑھ رہے تھے تاکہ وہ امریکی فوج کے ساتھ مل کر طالبان سے جنگ میں حصہ لے سکیں۔ اس کے علاوہ امریکی بحریہ کے تین طیارہ بردار بیڑے نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو چکے تھے اور امریکی نیوی کے طیارہ بردار جہاز کو بھی بحر اوقیانوس کے مشرق کی جانب روانہ ہونے کے احکامات جاری کر دیئے گئے۔ اس جنگ میں حصہ لینے کے لیے امریکی ریزرو فوجی پہلے ہی واشنگٹن میں جمع ہو رہے تھے۔

امریکہ نے ہمیشہ کی طرح اس جنگ کو جائز قرار دینے کے لیے اقوام متحدہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس طرح اقوام کی سلامتی کونسل نے بند کمرے میں گیارہ ستمبر کے واقعات کے حوالے سے ہونے والے خصوصی اجلاس کے بعد طالبان سے کہا کہ وہ اسامہ بن لادن کو فوراً امریکہ کے حوالے کر دیں۔ ایک واضح اور قدرے سخت پیغام میں طالبان حکومت سے اقوام متحدہ نے کہا کہ اس کے لیے صرف ایک ہی راستہ بچا ہے کہ وہ اقوام متحدہ کی قرارداد 1333 پر فوری غیر مشروط عمل کرے۔

اس کے بعد کے اجلاس میں سلامتی کونسل کے ارکان نے قرارداد نمبر 1333 کی توثیق کی جس میں کہا گیا کہ طالبان بغیر کوئی شرط رکھے اسامہ اور اس کے گروہ کے دیگر افراد کو فوری طور پر امریکہ کے حوالے کر دیں۔ تاکہ امریکی حکومت اپنے قانون کے مطابق ان پر مقدمہ چلا سکے۔ قرارداد میں نیروبی اور دارالسلام میں امریکی سفارتخانوں کو بم دھماکوں سے اڑانے کے الزام میں اسامہ بن لادن کو دہشت گرد اور مطلوب ملزم قرار دیا گیا تھا۔ سلامتی کونسل نے اس قرارداد کی توثیق کی اور نیویارک اور پینٹاگون پر ہونے والے حالیہ دہشت گردی کے حملوں میں بھی اسامہ بن لادن اور ان کے گروہ کو ملوث قرار دیا۔

سلامتی کونسل نے افغانستان میں تمام مبینہ دہشت گردی کے کیمپ فوری اور غیر مشروط طور پر بند کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ سلامتی کونسل نے طالبان کو صرف اور صرف ایک پیغام دیا کہ وہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قراردادوں پر فوری اور غیر مشروط عملدرآمد کریں۔ اس طرح امریکہ نے اقوام متحدہ کے ذریعے مزید ایک ناجائز کام کو جائز ہونے کی سند دلا دی اور امریکہ کے کہنے پر افغانستان کے مسلمانوں کو دہشت گرد ہونے کا اعزاز دیا جو کہ انسانیت کے خلاف ایک شرمناک حرکت تھی۔

ان تمام حالات کے بھی ہم مسلمان خود ہی ذمہ دار ہیں۔ جب ہم نے سوویت یونین کے جہاد کے دوران زیادہ ہی دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ امریکہ سے دشمنی لینا خطرناک ہو سکتا ہے مگر امریکہ سے دوستی اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ یہ بات اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ اپنے مفادات کے حصول

کی خاطر امریکہ کسی بھی ملک کے اندرونی معاملات میں دخل دینا اپنا حق سمجھتا ہے اور اپنے مقصد کو پانے کے لیے وہ کسی بھی بین الاقوامی ضابطے یا عالمی قوانین کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھتا اور قطب شمالی سے لیکر قطب جنوبی تک اور مریخ سے لیکر سمندروں کی تہوں تک وہ کسی بھی معاملے سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔

امریکہ کی نظریں اس خطے میں سب سے زیادہ ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ کوئی بھی ملک اس کی کارروائیوں میں کسی قسم کی مشکل پیدا نہ کرے۔ دوسرا وہ تیل کی دولت پر قابض ہونے کے بعد تمام تیل استعمال کرنے والے ممالک پر اپنی سیاسی، اقتصادی اور دفاعی پالیسی مسلط کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس خطے کی جغرافیائی حیثیت کو وہ دور دراز علاقوں میں پہنچنے کے لیے بیس کے طور پر استعمال کرے گا۔ سرد جنگ کے دوران اگر مسلمان ملکوں نے کھل کر اور اپنی سلامتی داؤ پر لگا کر امریکہ کی حمایت نہ کی ہوتی تو شاید آج حالات مختلف ہوتے۔

سوویت یونین کے ٹوٹتے ہی صورتِ حال یکسر بدل گئی اور دنیا پر حکمرانی کرنے والی واحد سپر طاقت امریکہ کا دوغلہ چہرہ سامنے آ گیا جس سے مسلمان نا آشنا تھے۔ سوویت یونین کے ملک پر قبضہ کے بعد مہاجرین سمیت افغانستان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ پاکستان سے منہ موڑ کر اس پر فوجی اور اقتصادی پابندیاں لگا دی گئیں اور مشرقِ وسطیٰ کے تیل کے کنوؤں پر قبضے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسی دوران مغربی میڈیا نے ہلال وصلیب کو ایک دوسرے کا حریف ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ انہوں نے تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ دیا اور کہا کہ یہ درست ہے کیونکہ جن ملکوں کے ساتھ بھی مسلمان ملکوں کی سرحدیں ملتی ہیں وہ انہیں چین سے رہنے نہیں دیتے۔ اس لیے مسلمانوں کے قتل و غارت والے رویئے کو دبانا بہت ضروری ہے۔ ورنہ وہ پوری دنیا پر اپنی تہذیب مسلط کر دیں گے۔

سرد جنگ کے زمانے میں جو لوگ امریکی ''تاج'' کا ہیرا تھے اور امریکہ کے ہراول دستے تھے، اب اچانک ''اچھوت'' خونخوار اور دہشت گرد قرار دے دیا گیا اور ان کے خلاف زبردست مہم شروع کر دی گئی۔ افغان جنگ کے خاتمے کے فوری بعد جو انتہائی اہم واقعہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ صدام نے 90ء کے آخر میں امریکہ کے کہنے پر اچانک کویت پر اپنا دعویٰ کر دیا۔ اس کی فوجیں اٹھیں اور ایک ہی دن میں پورے کویت کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ امریکہ نے اس دوران مشرقِ وسطیٰ میں اپنے آپ کو بہت مضبوط بنانے کا منصوبہ بنایا۔ مغربی میڈیا نے چیخ وپکار شروع کر دی کہ صدام سارے مشرقِ وسطیٰ کے لیے ایک سنگین خطرہ ہے جو کویت پر قابض ہو چکا تھا۔ اس لیے اس کا مقابلہ کرنا ضروری تھا۔ امریکہ کی زیرِ قیادت

32 ملکوں کا اتحاد قائم ہوا جو دنیا کو "صدام کے نظریہ" سے آزاد کرانے کے لیے مشرق وسطیٰ کی طرف روانہ ہو گیا۔ صورت حال انتہائی مضحکہ خیز تھی کیونکہ ایک طرف عراق تھا جو ایران سے 10 سال امریکہ کے کہنے پر جنگ لڑ کر نڈھال ہو چکا تھا۔ بلاشبہ عراق کے پاس ایک بڑی فوج تھی اور ایران کے خلاف جنگ میں استعمال کرنے کے لیے امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں کے دیئے ہوئے چند ہتھیار بھی، لیکن یہ بڑی فوج پچھلے دس سال سے جنگ لڑ کر تھک ہار چکی تھی۔ دوسری طرف امریکہ اور دوسرے اتحادی تھے جن کے پاس ایسے جدید ہتھیار تھے کہ وہ پوری دنیا کو کئی بار تباہ و برباد کر سکتے تھے۔ ان دنوں یہ بات بھی اٹھائی گئی کہ عراق کی پیش قدمی روکنے کے لیے اسرائیل ہی کافی ہے۔ جسے امریکہ نے جدید اور ایٹمی ہتھیاروں سے مضبوط ملک بنا دیا ہے۔ لیکن اس صورت حال میں یہ جنگ عرب اسرائیل جنگ کا روپ دھار لیتی اور نقصان یقیناً اسرائیل کو ہوتا جو امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک کسی صورت بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ دوسرا امریکہ کا مشرق وسطیٰ کے تیل کے ذخائر پر قابض ہونے کا خواب بھی شرمندہ تعبیر نہ ہوتا اور یہ سب کچھ ایک پہلے سے تیار منصوبہ کا حصہ تھا۔ اس جنگ کا نتیجہ سب کو معلوم تھا۔ اس کے بعد جب صدام حسین بغداد جا بیٹھا تو عراق کی کرد اور شیعہ آبادیوں کو امریکہ نے صدام حسین کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا اشارہ دیا اور بھرپور مدد کا یقین دلایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ صدام نے ان دونوں کی طرف سے کی جانے والی "مزاحمت" کو بہت بری طرح کچل دیا۔ ہزاروں شیعہ اور کرد مارے گئے لیکن امریکی مدد ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس جنگ نے اپنے اسباب کے باعث اور اپنے ناگزیر نتیجے کے طور پر مسلمانوں میں ایسے طبقے کو، جو سرد جنگ میں امریکہ کا اتحادی تھا، امریکہ مخالف ردعمل کا شکار کر دیا۔ ان میں زیادہ تر ایسے لوگ تھے جنہیں عام مسلمانوں سے زیادہ امریکی ادارے جانتے تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ امریکہ نے انہیں دھوکہ دیا ہے کیونکہ سوویت یونین کے خلاف امریکہ کا یہ موقف تھا کہ "خدا کے دشمنوں" سے جنگ کرو لیکن سوویت یونین کے بکھرتے ہی امریکہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا خیال کیے بغیر مقدس سرزمین پر آ کر قابض ہو گیا۔ اسامہ اور اس کے ساتھی بھی امریکہ کی اسی دوغلی پالیسی کے خلاف مسلمانوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اسامہ جہاد افغانستان کے بعد سے دس سال تک اس ملک میں رہا مگر اس کے ہمسایہ ممالک کو بھی پتہ نہ چل سکا کہ اس کی تنظیم کا نام القاعدہ ہے مگر امریکہ نے اچانک دنیا کے سامنے ایسا پروپیگنڈہ کیا کہ دنیا اس جھوٹ کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئی۔

سرد جنگ کی کشمکش اور اس کے بعد کی صورتحال نے مسلمانوں کے دامن میں سوائے ندامت اور تکلیفوں کے کچھ نہیں ڈالا۔ کشمیر ہو یا فلسطین، بفور کے باسی ہوں یا الجزائر کے باشندے ہر جگہ مسلمانوں کا خون انتہائی ارزانی سے بہایا جا رہا ہے اور اس کے "تاوان" کے طور پر مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے۔ آج دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہونے اور ستر فیصد سے زائد معدنی تیل کے مالک ہونے کے باوجود مسلمانوں کی عالمی سطح پر کوئی موثر آواز نہیں ہے بلکہ دنیا کی بساط پر انہیں مہروں کی طرح جدھر جی چاہا دھکیل دیا جاتا ہے۔ اس مسئلے سے نبٹنے کے لیے مسلمانوں نے 1969ء میں عالمی اسلامی تنظیم (او آئی سی) کی بنیاد رکھی تھی لیکن اس کی ناکامیوں کی بڑی بڑی داستانوں کے سوا آج تک کوئی حل سامنے نہ آسکا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ مسلمانوں کے مسائل میں جب بھی سنگین حد تک اضافہ ہوا ہے، یہ بڑے فنکارانہ انداز میں منہ پھیر لیتی ہے۔ افغانستان ہو یا عراق، ان مسائل کے حل کے لیے اجلاس بلائے جاتے ہیں مگر جب تک اجلاس منعقد ہوتا ہے، اس وقت تک صورتحال ہی تبدیل ہو چکی ہوتی ہے۔

دوسری طرف اقوام متحدہ میں بھی مسلمانوں کی آواز نہ ہونے کے برابر ہے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے پانچ مستقل ارکان ہیں لیکن ان میں ایک بھی مسلمان نہیں ہے۔ صورت حال ایسی ہے کہ مسلمان عالمی معاملات میں مثبت اور موثر مداخلت تو کیا اپنے خلاف ہونے والے پراپیگنڈہ کا جواب دینے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے۔ مسلمانوں نے زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھ کر وقت کیساتھ چلنا بالکل نہیں سکھا۔ ترقی یافتہ مغربی دنیا انیسویں صدی میں فیوڈل سوسائٹی سے صنعتی معاشرے میں تبدیل ہو کر کمیونیکیشن اور میڈیا کے دور میں داخل ہو چکی ہے اور ہم آج بھی قرونِ وسطیٰ کی تلواریں تیز کرنے میں مگن ہیں۔

افغانستان پر حملے کا جواز امریکہ نے اپنے میڈیا سے موثر پروپیگنڈے کی صورت میں تلاش کیا۔ مختصر یہ کہ امریکہ نے افغانستان پر حملے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی فوجوں کو دنیا کے سب سے پسماندہ ملک کو تباہ و برباد کرنے کے لیے روانہ ہونے کا حکم دیا جو کئی سالوں سے غیر ملکی تسلط اور ان کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے پہلے ہی تباہی کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ اس فیصلے کے بعد دنیا بھر کے 600 سے زائد چھوٹے بڑے شہروں میں کروڑوں امن پسند سڑکوں پر نکلے اور چیخ چیخ کر اس جنگ کی مخالفت کی۔ اس طرح امریکہ کا یہ الزام بھی اپنی موت آپ مر گیا کہ مسلمان چونکہ شدت پسند ہیں، اس لیے صرف وہی سڑکوں پر مظاہرے کرتے ہیں، جس طرح امریکیوں کے پتلے نذر آتش کرتے اور امریکی پرچم جلاتے تھے، اس سے لگتا تھا

کہ امریکیوں کا بس چلے تو وہ پوری مغربی تہذیب کو بھی تباہ و برباد کرڈالے گا۔اس طرح ثابت ہو گیا کہ صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا امریکی پالیسیوں کے خلاف سراپا احتجاج بنی ہوئی تھی۔مگر امریکی حکمرانوں نے کروڑوں لوگوں کی پرواہ کیے بغیر افغانستان پر حملے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

امریکہ افغانستان کی جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے جنگ جیتنے میں شکوک وشبہات کا شکار تھا۔وہ جانتا تھا کہ افغان مجاہدین سے گوریلا جنگ جیتنا ناممکن ہے۔اس لیے انہوں نے غوروفکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اس جنگ کو جیتنے کے لیے شمالی اتحاد کی حمایت اور مدد نہایت ضروری ہے، جو طالبان حکومت کے شدید مخالف تھے۔اس سلسلے میں سی آئی اے کی ٹیم کو افغانستان کے شمال مشرق میں بھیجا گیا۔اس ٹیم نے شمالی اتحاد کی فوجوں کا جائزہ لیا اور اس پر اعتماد کا اظہار کیا مگر ان کے پاس طالبان پر حملے کے لیے کافی فوجی یا بھاری ہتھیار نہیں تھے۔اس کے بعد شمالی اتحاد کو جدید اور بھاری ہتھیاروں سے لیس کردیا گیا اور وہ اس پوزیشن میں آ گئے کہ وہ طالبان کا مقابلہ کرسکیں۔اس کے علاوہ تمام ٹیموں کے لیے ایک پیغام تھا جو افغانستان میں طالبان کے خلاف اس جنگ میں حصہ لے رہے تھے۔اس کے اہم نکات یہ تھے:

1......تمام قبائلی اتحادیوں کو باہر نکل کر اپنے طیاروں کو شناخت کرنے کی ہدایت کی جائے۔

2......تمام قبائل کو ہر قسم کی فوجی نقل وحرکت روک دینے اور اگلی ہدایات کا انتظار کرنے کے لیے کہا جائے۔

3......مخالف قوتوں کو تنہا کردینے کے لیے کارروائی کرنی ہے لیکن حرکت کرنے سے پہلے حکم کا انتظار کرنا ہے۔

4......سی آئی اے کے تمام ایجنٹس اور امریکہ کے حامی پورے افغانستان میں فوری تباہی وبربادی پھیلانے کا کام شروع کردیں۔اس دوران طالبان کے دفاتر پر بم استعمال کریں۔طالبان کے فوجی قافلوں کو نشانہ بنائیں۔طالبان کو ہر قسم کی امداد منقطع کردیں۔ان کے ہتھیاروں کے ذخائر تباہ کردیں۔

5......تمام ایجنٹس کو مطلع کیا جاتا ہے کہ پیرا ملٹری ٹیمیں جنوب میں اتریں گی اور فضائی کارروائی کے ساتھ مل کر عمل کریں گی۔

6......تمام لوگوں کو بتا دیا جائے کہ کن علاقوں کو نشانہ نہیں بنانا ہے۔

7......یہ بھی شناخت کیا جائے کہ اسامہ بن لادن اور القاعدہ کی قیادت کن راستوں سے فرار ہوسکتی ہے اور ان تمام راستوں کی کڑی نگرانی کی جائے۔

8......تمام قیدیوں سے پوچھ گچھ اور معلومات حاصل کرنے کے لیے تیاریاں کی جائیں۔

9......کارروائی کے دوران انسانی ضرورتوں کا تخمینہ رکھا جائے۔ سی آئی اے اور تمام مراکز اور ٹیمیں جنرل فرینکس اور ملٹری کمانڈروں کے ساتھ رابطے میں رہے۔

اس طرح امریکہ نے جنگ کی مکمل منصوبہ بندی کر لی اور افغانستان میں مختلف اشتہاروں کے ذریعے طالبان مخالف گروپوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی بھی کوشش کی جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا۔ کیونکہ افغانستان کے بڑے حصے پر وار لارڈز قابض تھے جو لالچی تھے اور امریکی امداد کے منتظر تھے۔ امریکہ کے شمالی اتحاد کی طرف اس قدر جھکاؤ نے پاکستان کو خوفزدہ کر دیا تھا کہ شمالی اتحاد کے کابل پر قابض ہونے کے بعد روس اور ایران کا اثر ورسوخ مزید بڑھ جائے گا جو پاکستان کی سلامتی کے لیے بھی ایک خطرہ تھا۔ کیونکہ شمالی اتحاد کے بھارت کے ساتھ بھی قریبی تعلقات تھے۔

مختصر یہ کہ امریکی فضائیہ نے 7 اکتوبر 2001ء کو 25 لڑاکا بمبار طیارے اور 50 ٹوماہاک کروز میزائل استعمال کیے۔ اس کے علاوہ 15 عدد بمبار طیاروں نے مشرق وسطیٰ میں ہوائی اور بحیرہ ہند میں امریکہ اور برطانیہ کے جنگی بحری جہازوں نے بھی اس کارروائی میں حصہ لیا۔ امریکہ نے اپنے اہداف کی کل تعداد 31 بتائی جن میں القاعدہ بریگیڈ، قبل از وقت اطلاع دینے والا ریڈار، القاعدہ اور طالبان کی فوجی تنصیبات، طالبان کے جنگی طیارے، طالبان کے فوجی ہوائی اڈے، رن ویز، القاعدہ کے فوجی تربیتی کیمپ اور زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائلوں کی سائٹس شامل تھیں۔ اس طرح امریکی اور اتحادی فوجوں نے چند ہی دنوں میں افغانستان کو کھنڈر میں تبدیل کر دیا۔ ان کے بمبار جہازوں کی بمباری مسلسل جاری رہی، جس نے طالبان کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا۔

مگر دوسری طرف امریکی اور اس کے اتحادی زمینی کارروائی کرنے سے ابھی خوفزدہ تھے۔ اس دوران 28 اکتوبر 2001ء کو ایسی خبر آئی جس نے تمام اتحادیوں کو مشکل میں ڈال دیا اور وہ خبر پاکستان اور القاعدہ کے درمیان ایٹمی ہتھیاروں کے متعلق معلومات اور روابط موجود تھے۔ رپورٹ کے مطابق ایٹمی سائنسدان القاعدہ کے لوگوں کو ایٹمی ہتھیار بنانے میں مدد کر رہے تھے۔ امریکی خفیہ ایجنسیاں اس نتیجے پر پہنچیں کہ کم از کم ریڈیائی تابکار ہتھیار بنائے جاسکتے ہیں اور کوئی دوسرا بڑا حملہ امریکہ پر ہونے والا ہے۔ ایجنسیوں کے مطابق تابکار بم بڑے شہروں میں بڑی تباہی پھیلا سکتے تھے۔ مگر یہ سب کچھ ایک خام خیالی ثابت ہوا۔ امریکہ کے ظلم وستم کی انتہا تب ہوئی جب اس نے

مظلوم مسلمانوں کے مقدس مہینے یعنی رمضان میں بھی امریکی بمباری جاری رکھی۔ بش نے اس کے متعلق تمام مسلم ممالک کے سربراہوں کو مطلع کر دیا مگر مسلمانوں کی بے حسی ایسی تھی کہ کسی ملک کے سربراہ نے بھی کھل کر احتجاج نہ کیا۔ اسی دوران امریکہ کی انٹیلی جنس نے وہ شخص ڈھونڈ نکالا جو آئندہ افغانستان کا سربراہ بننے والا تھا۔ اور وہ تھا حامد کرزئی۔ وہ بھی امریکہ کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھا۔ وہ جنوبی افغانستان میں تھا جہاں اس کے پاس پانچ سو کے قریب جنگجو تھے۔ امریکہ نے ایسے غاروں کی تعداد 150 بتائی جہاں القاعدہ کی قیادت چھپ سکتی تھی۔ ان میں سے آدھے غاروں کو امریکی فضائیہ نے پہلے ہی تباہ و برباد کر دیا تھا۔ تین نومبر کو اتحادی کابل سے صرف 100 میل دور تھے جو مختلف سمتوں سے حملہ آور ہو رہے تھے۔ امریکہ کی ڈیلٹا ٹیم مغرب میں خلیلی سے مل چکی تھی اور اس کا رابطہ ''جبر اتوڑ'' اور جنرل فہیم سے بھی ہو چکا تھا۔ دو ٹیمیں شمال میں سرگرم تھیں۔ ان میں ایلفا ٹیم مزار شریف کے علاقے میں دوستم کیساتھ تھی۔ بریو (Bravo) عطا محمد کے ساتھ تھی۔ امریکہ نے پانچ نومبر 2001ء میں اپنے فضائی حملوں میں 20 سے 30 فیصد تک اضافہ کیا اور اپنی کارروائیوں میں اضافہ موسم کی وجہ سے بھی کرنا پڑا۔

دوسری طرف بامیان میں خلیلی اور سپیشل فورسز مل کر کارروائی کر رہی تھیں۔ خلیلی نے بامیان پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب خلیلی کی فوجیں قندھار کی طرف پیش قدمی کر رہی تھیں جس کے بعد وہ کابل کی طرف بڑھیں گی۔ اتحادیوں کو اسی دوران ایک اور کامیابی تب ملی جب اسماعیل خان نے ہرات پر قبضہ کر لیا مگر اتحادیوں کو سب سے حیرانگی کابل کو فتح کرنے پر ہوئی کیونکہ وہ یہاں بہت بڑی مزاحمت کی توقع کر رہے تھے مگر طالبان نے اتحادیوں کی طاقت کا قبل از وقت اندازہ لگا لیا اور اپنے ساتھیوں کو محفوظ جگہ منتقل ہونے کا کہا جس کی وجہ سے زیادہ خونریزی نہ ہو سکی۔ شمالی اتحاد کے دس سے بارہ ہزار فوجی پانچ پانچ سو کے دستوں میں کابل داخل ہو چکے تھے۔ امریکہ کو اب یہ خطرہ تھا کہ طالبان اب جنوب کی پہاڑیوں سے کابل پر گولہ باری کریں گے۔ کابل کی آسان فتح کا اصل سبب ایک پشتون کمانڈر تھا جس نے طالبان سے غداری کی اور اپنے چار ہزار فوجیوں کیساتھ شمالی اتحاد سے جا ملا۔ شمالی اتحاد کی پیش قدمی کرنے والی فوج کا کمانڈر یہی جنرل فہیم تھا۔ کابل کے بعد اس نے جنوب کی طرف پیش قدمی شروع کر دی جس کا مقصد مزید پشتون لیڈروں کو اپنے ساتھ ملانا اور جنوبی افغانستان کے بڑے علاقے پر قبضہ کرنا تھا جو طالبان

کے دور میں ان کے پاس تھا۔ اسماعیل نے بھی ہرات پر قابض ہونے کے بعد قندھار کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ اور سات دسمبر کو طالبان کے روحانی مرکز قندھار پر قبضہ کر لیا گیا۔ شمالی اتحاد اور ان کے اتحادی پشتون قبائل اور امریکی قندھار میں داخل ہو چکے تھے۔ اس ضلع میں 110 سی آئی اے افسران، 316 سپیشل فورسز، ایجنٹس اور غیر معمولی فضائی طاقت نے بنیادی کردار ادا کیا۔ اسی طرح امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے یکے بعد دیگرے تمام افغان شہروں کو فتح کر لیا اور یوں افغانستان پر ایک بار پھر جبر و تشدد کے بعد ایک نئی حکومت قابض ہو چکی تھی۔ اس جنگ میں طالبان کے علاوہ 30 ہزار مظلوم شہری بھی ہلاک ہوئے۔ جس کی تمام تر ذمہ داری امریکہ پر جاتی ہے۔ مگر اتنے کم عرصے میں پورے افغانستان پر قابض ہونے کے باوجود وہ اپنے اصل ہدف کو نہ پا سکا یعنی وہ اسامہ بن لادن کی تلاش میں ناکام ہو چکا تھا۔ اتحادیوں کی فتح کے بعد افغانستان کی تاریخ کے مطابق امریکہ کو ڈر تھا کہ کہیں یہ تمام دھڑے آپس میں جھگڑنا شروع نہ کر دیں۔ اس لیے جلد از جلد عبوری حکومت کے قیام پر زور دیا۔ مگر ان کو افغانی صدارت کے لیے ایسا بندہ چاہیے تھا جو کہ ان کا وفادار اور اعتماد والا ہو۔ اس تلاش کے نتیجے میں جو نام سب سے نمایاں اور سب کے لیے قابل قبول تھا۔ وہ حامد کرزئی کا تھا۔ جو انگریزی کلچر سے واقف تھا اور انگریزی بھی جانتا تھا۔ اس پر پاکستان اور ایران کو بھی اعتماد تھا۔ اس مرحلے کو مکمل کرنے کے لیے بون، جرمنی میں ایک کانفرنس، اقوام متحدہ کے زیر اہتمام منعقد ہوئی۔ اس میں افغان اپوزیشن پارٹیاں اور انکے لیڈر متفقہ لیڈر کے انتخاب کے لیے اکٹھے ہوئے۔ شمالی اتحاد اور جنوب کے پشتون لیڈروں نے کرزئی کو آسانی سے اپنا لیڈر قبول کر لیا۔ 22 دسمبر 2001 کو کابل میں کرزئی کی تقریب حلف برداری ہوئی۔ افغانستان میں حکومت کی تبدیلی میں گیارہ ستمبر کے بعد 102 دن کا عرصہ لگا۔

اس کے بعد دسمبر کے آخر تک اتحادی فوج نے تورا بورا میں ایک جنگ شروع کر دی۔ تورا بورا 15 ہزار فٹ بلندی پر واقع ہے۔ سی آئی اے نے رپورٹ دی کہ اسامہ بن لادن اور طالبان کے بہت سے قائدین نے تورا بورا میں پناہ لے رکھی ہے۔ سی آئی اے کی دو اور سپیشل آپریشنز کی تین ٹیمیں افغان مخبروں کی رہنمائی میں اس علاقے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے اپنے لیزر آلات کی مدد سے ان غاروں کی نشاندہی کی۔ یہاں ممکنہ طور پر طالبان اور القاعدہ کے مراکز

تھے۔ ان مقامات کو B-52 طیاروں نے جدید ترین بموں سے نشانہ بنایا۔ ادھر پاکستانی فوج نے بھی افغانستان سے فرار ہونے والے سینکڑوں طالبان کو گرفتار کیا۔ اس طرح طالبان کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا اور انہوں نے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر کاروائیاں کرنے کا فیصلہ کیا جو آج تک جاری ہیں۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ جتنے کم عرصے میں امریکہ نے افغانستان فتح کر کے اپنی کٹھ پتلی حکومت تشکیل دے دی۔ اتنے عرصہ میں تو کوئی چھوٹا سا منصوبہ بھی اپنی تکمیل تک نہیں پہنچتا۔ تو آخر کیا وجوہات ہیں جن کی وجہ سے مسلمان آج ذلیل و رسوا ہو رہے ہیں۔ افغانستان کے بعد عراق پر بھی بغیر کسی بھاری مزاحمت کے قابض ہو گیا۔ جہاں لاکھوں معصوم مسلمانوں کا خون ناحق بہا دیا گیا۔ اب ہم مسلمانوں کی ناکامی اور زوال کی حالت پر آنے کی وجوہات تلاش کرتے ہیں۔

مسلمانوں کی کمزوری اور پیچھے رہ جانے کی ایک بڑی وجہ اپنے آپ کو جدید تقاضوں کے مطابق نہ ڈھالنا ہے۔ دنیا کا مقابلہ کرنے کے لیے آج جدید سائنس کی تعلیم بہت ضروری ہے۔ اسی طرح خدا پر توکل کرنے کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ ہم معاشی اعتبار سے آنے والے وقت کی فکر چھوڑ دیں کیونکہ دین اسلام بھی یہی تعلیم دیتا ہے کہ "اپنے اونٹ باندھ کر توکل کرو۔"

اس وقت مسلمانوں میں تعلیم کی صورت حال یہ ہے کہ دو چار اسلامی ممالک کے سوا پورے 56 یا 57 ملکوں میں 50 فیصد سے زیادہ شرح خواندگی کا حامل ملک نہیں ملتا۔ جبکہ مغربی ملکوں میں کہیں بھی 99 فیصد سے کم شرح خواندگی والا ملک نہیں ملتا۔ سری لنکا جیسے چھوٹے ٹوٹے ملک کی شرح خواندگی 99 فیصد ہے۔ پورے عالم اسلام کے پاس کوئی جدید یونیورسٹی نہیں ہے۔ جامعات تو کئی ہیں لیکن ان میں کسی بھی انٹرنیشنل یونیورسٹی مثلاً ہارورڈ، آکسفورڈ، یا ان جیسی دوسری یونیورسٹیوں کا مقابلہ تو درکنار ان کے 50 فیصد پر بھی پورا اترنے کی صلاحیت ہے اور نہ اہلیت۔

پورے عالم اسلام میں ایک خوفناک قسم کا جمود نظر آتا ہے۔ عباسی خلیفہ مامون الرشید سے لے کر دور حاضر تک مسلمان ملکوں میں بمشکل ایک لاکھ غیر ملکی کتابوں کے تراجم شائع ہوئے ہوں گے جبکہ مغربی یورپ کے ایک ملک سپین میں ایک برس میں ایک لاکھ سے زیادہ کتابیں شائع ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح پورے عالم اسلام میں جتنی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ صرف مشرقی یورپ کے ملک

یونان میں ہی ان سے پانچ گنا زیادہ شائع ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ امریکہ میں اس وقت ساڑھے چار لاکھ کے قریب ریسرچ سکالرز موجود ہیں جبکہ پورے عالم اسلام میں 50 ہزار سے بھی زیادہ نہ ہوں گے۔

اقتصادیات کا یہ عالم ہے کہ پورے عالم اسلام کی جی ڈی پی 1200 ارب ڈالر ہے جبکہ مغربی یورپ کے ایک ملک جرمنی کی جی ڈی پی اڑھائی کھرب ڈالر ہے۔ جبکہ جاپان، فرانس اور امریکہ سے کہیں زیادہ آگے ہیں۔ یہ وہ خوفناک حالات ہیں جو ہمیں اپنی بدنصیبی کے اسباب کا آئینہ دکھاتی ہے۔

اگر ہم نے ان تمام اقدامات کی طرف جلد کوئی توجہ نہ دی تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ امریکہ کے ہاتھوں ساری اسلامی دنیا کی بربادی یقینی ہے۔ خاص کر اس خطے پر قابض ہونا امریکہ کے لیے بہت ضروری ہے کیونکہ اس خطے میں مستقبل کی دو عظیم طاقتیں یعنی چین اور جاپان ہیں۔ امریکہ کے پورے ایشیا کے بارے میں عزائم کا پتہ امریکی محکمہ دفاع کی اس رپورٹ سے ہوتا ہے جو اس نے مشرقی ایشیا سے وابستہ اپنے مفادات کے لیے تیار کی تھی، جس میں بتایا گیا تھا کہ:

''امریکہ کے نزدیک مشرقی ایشیا اور بحرالکاہل کے تحفظ کی جو اہمیت ہے، اس کا اظہار جاپان کوریا اور فلپائن کے ساتھ ہونے والے دوطرفہ معاہدوں سے اچھی طرح ہو جاتا ہے۔ پھر منیلا کے معاہدہ کے تحت تھائی لینڈ بھی ہمارا ساتھی ہے۔ ہم نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے ساتھ بھی معاہدہ کر رکھا ہے۔ کوریا اور جاپان میں ہماری بری و فضائی فوج موجود ہے جبکہ ہمارا ساتواں بیڑا بحرالکاہل میں تعینات ہے۔ اپنے منصوبوں کی مدد سے ہم جن مقاصد کی تکمیل کے خواہاں ہیں' وہ یہ ہیں:

1......اپنے بحری راستوں اور مذکورہ خطے سے وابستہ امریکی مفادات کا تحفظ

2......بحرالکاہل اور مشرقی ایشیا میں اپنی ذمہ داریاں نبھانا اور بھرپور صلاحیت کو بروئے کار لانا۔

3......سوویت یونین' شمالی کوریا اور ویت نام کو دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے سے روکے رکھنا۔

4......چین کے ساتھ مستقل بنیادوں پر فوجی نوعیت کے روابط قائم کرنا۔

5......دوست ملکوں کے استحکام اور آزادی کو قائم رکھنے کے لیے بھرپور مدد دینا۔

ان تمام باتوں سے ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ امریکہ کے عزائم نہایت خطرناک ہیں اور

وہ ساری دنیا پر حکمرانی کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔اس طرح امریکہ اپنی بنائی ہوئی ولدل میں خود ہی پھنس جائے گا۔اس نے دوسرے ممالک میں بڑی تعداد میں فوجی تعینات کر رکھے ہیں اور اس کے عالمی مفادات کے تحفظ کے سلسلے میں امریکہ معاشی مشکلوں کا شکار ہو چکا ہے۔امریکہ دنیا کا سب سے بڑا قرض دینے اور ملک سے باہر سرمایہ کاری کرنے والا ملک تھا لیکن چند ہی برسوں میں اپنے شیطانی نظریے کی وجہ سے وہ دنیا کا مقروض ترین ملک بن گیا ہے۔اس وقت امریکی قرض کی رقم تقریباً 20 ٹریلین ڈالر تک پہنچ چکی ہے۔معاشی مشکلات کے علاوہ امریکہ عراق اور افغانستان جیسی ولدل میں پھنس چکا ہے جہاں مزاحمت ہر دن کیساتھ بڑھتی جا رہی ہے اور وہ دن دور نہیں جب امریکہ ان دو ملکوں سے ذلیل ورسوا ہو کر نکلے گا۔جس طرح یہ ویت نام سے گیا تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ امریکہ اربوں ڈالر خرچ کرنے کے باوجود ابھی تک کابل سے باہر اپنی کٹھ پتلی حکومت کو مستحکم نہیں کر سکا اور دوسرے تمام صوبوں پر افغان جنگجو سرداروں کی حکمرانی ہے جن کی حمایت امریکہ ڈالروں سے حاصل کرتا ہے۔اور ایک تجزیہ نگار کے مطابق جس دن امریکہ نے ان کو ڈالروں کی فراہمی روک دی، یہی لوگ امریکہ کیساتھ بغاوت کر کے اس کے دشمن بن جائیں گے اور امریکہ سے یہ طوفان زیادہ دیر نہیں سنبھلے گا۔اور ان کو بھی سوویت یونین جیسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔اب تک امریکہ کا افغانستان میں بھاری جانی و مالی نقصان ہو چکا ہے۔لیکن وہاں میڈیا کے زیادہ موثر نہ ہونے کی وجہ سے اطلاعات نہیں پہنچتیں۔اب ہم ان ہلاکتوں کا جائزہ لیتے ہیں:

سال	ہلاک ہونے والے امریکی فوجی
2005ء	77
2004ء	52
2003ء	47
2002ء	43
2001ء	12
ٹوٹل	223

زخمیوں کی تعداد:

سال	زخمی ہونے والے امریکی فوجی
2005ء	166
2004ء	214
2003ء	96
2002ء	72
2001ء	35
ٹوٹل	814

ان اعداد و شمار سے بھی ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وقت کیساتھ ساتھ مزاحمت میں تیزی آ رہی ہے اور ایک دن آئے گا جب ہم سب امریکہ کی بربادی کا جشن منائیں گے جس طرح سوویت یونین کے خاتمے پر منایا گیا تھا۔

عراق، ایران اور امریکہ تاریخ کے آئینے میں

آج کی مادہ پرست دنیا میں انسانیت کے رشتوں کی قدر نہ ہونے کے برابر ہیں۔ آج سے لاکھوں سال پہلے شروع ہونے والے فسادات اور جنگوں میں کروڑوں لوگ لقمۂ اجل بن گئے مگر ہم یہ وجہ پیش کر سکتے ہیں کہ پہلے وقتوں کے لوگ زیادہ مہذب اور تعلیم یافتہ نہ تھے مگر آج کا انسان چاند تک کا سفر کرنے کے باجود بھی انسان ہونے کے معیار تک نہ پہنچ سکا۔ کسی طوفان میں گھرے ہوئے لوگوں کو بچانے کے لیے کروڑوں ڈالر خرچ کیے جاتے ہیں، جبکہ جو لوگ ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں ان کی ہنستی کھیلتی دنیا کو اپنے ''لالچ'' کے لیے تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔ اگر ہم تاریخ کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ دنیا کی تاریخ اور نقشہ بدلنے میں امریکہ کی ہٹ دھری ہی تھی جو اپنی طاقت کے ذریعے ساری دنیا کو یرغمال بنانا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ کسی حد کو بھی پار کر سکتا ہے۔ جس کی چند مثالوں میں عالمی جنگ ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم گرانا، ایران و عراق کا تصادم، کوریا اور ویت نام کی مداخلت، عراق کا کویت پر حملہ اور پھر عراق پر حملہ، بوسنیا میں خانہ جنگی، نئی صدی کے آغاز میں افغانستان اور عراق میں ظلم کی انتہا۔ ان تمام واقعات میں کروڑوں لوگوں کو بغیر کسی وجہ سے موت کی نیند سلا دیا گیا۔ آج مغربی ممالک اور امریکہ میں کسی ''جانور'' کے تحفظ کے لیے لاکھوں لوگ سڑکوں پر احتجاج کے لیے جمع ہو جاتے ہیں اور ان کو تحفظ مہیا کرنے کے لیے تنظیمیں بن جاتی ہیں مگر آج لاکھوں مسلمانوں کو بے رحمی سے قتل کیا جا رہا ہے مگر کوئی تنظیم ان کے تحفظ کے لیے آواز بلند نہیں کرتی۔ شاید آج کے مسلمان کے خون کی قیمت پانی کے برابر ہے۔ عراق میں لاکھوں لوگ کسی مدد کے انتظار میں بے یار و مددگار زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پہلی خلیجی جنگ کے نتیجے میں بہت سے عراقیوں کو قتل کر دیا گیا۔ عراق ہمیشہ سے جنگ و فساد کی بیماریوں کا شکار رہا ہے۔ اس کی وجہ اس کی جغرافیائی اہمیت ہے۔ اسی وجہ سے یہ ظالم حکمرانوں کی ہوس کا شکار رہا

ہے۔انیسویں صدی کے آخر میں جب اس علاقے میں تیل دریافت ہوا تو یورپی اقوام نے وقت ضائع کیے بغیر اس پر قبضہ کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔انہوں نے سلطنت عثمانیہ پر نظریں جمائیں اور اسے تقسیم کر دیا۔عراق اور دوسری عرب ریاستیں نو آبادی بن گئیں۔حالانکہ جنگ کے بعد ان کی آزادی کا وعدہ کیا گیا تھا۔فرانس نے شام لبنان اور شمالی عراق پر قبضہ جما لیا۔برطانیہ نے جنوب میں بغداد اور بصرہ پر قبضہ جما لیا جبکہ کردوں کو برطانیہ کے زیر تسلط ایک علیحدہ علاقے میں رکھا گیا۔جب ان کردوں نے آزادی حاصل کرنے کے لیے آواز بلند کی تو چرچل نے کہا ''میں اس غیر مہذب قبیلہ کیخلاف زہریلی گیس استعمال کرنے کے حق میں ہوں۔'' عراق کے کٹھ پتلی بادشاہ کو استعمال کرتے ہوئے ان کردوں کو دبانے کے لیے آرٹلری اور فاسفورس بم استعمال کیے گئے۔اس طرح تیل کا بڑا ذخیرہ برطانیہ کی تحویل میں رہا۔

1958ء میں جب عراق کی بادشاہت ختم ہوئی تو نئی حکومت نے خود کو سوشلسٹ ظاہر کیا۔ 1963ء میں عراق پٹرولیم کمپنی جو غیر ملکی تھی۔امریکی سی آئی اے نے قیامت برپا کر دی۔اس وقت مشرق وسطیٰ سی آئی اے کے سربراہ جیمز کریش فیلڈ نے اسے اپنی شاندار کامیابی قرار دیا۔بعث پارٹی کے سیکرٹری جنرل نے اعتراف کیا کہ ہم امریکی سی آئی اے کی مدد سے ایوان اقتدار میں داخل ہوئے۔بعد ازاں تشدد کے واقعات نے صدام حسین کو جنم دیا جو 1979ء میں اعلیٰ منصب تک پہنچ گئے۔امریکہ نے صدام کے لیے کافی کچھ کیا۔وہ بعث پارٹی کو برسر اقتدار لائے۔انہوں نے صدام حسین کی مدد کی۔ ایران کے خلاف حملہ میں بھی مدد کی۔داخلی بغاوتوں کو کچلنے کے لیے بھی سی آئی اے نے بھرپور تعاون کیا مگر اس کے بدلے میں صدام حسین نے بھی امریکی مفادات کے لیے تمام تر وسائل کا استعمال کیا۔جس میں سب سے بڑا کارنامہ ایران کے خلاف جنگ اور اس کے اسلامی انقلاب کو دوسری عرب ریاستوں تک پہنچنے سے روکا۔یہ امداد عراق کویت پر حملہ تک مسلسل جاری رہی۔

امریکہ کی اس محبوب ریاست نے ایران کے خلاف فتح کا اعلان کیا تھا۔اس جنگ کے نتیجے میں دس لاکھ سے زائد مسلمان ہلاک وزخمی ہوئے۔جب انسانی حقوق کے گروپوں نے اس بات کے ثبوت پیش کیے کہ صدام حسین نے ایرانی فوجیوں اور کرد شہریوں کے خلاف زہریلی گیس اور اعصابی گیس کا استعمال کیا ہے تو امریکی محکمہ خارجہ نے اس کی مذمت کرنے سے انکار کر دیا۔

عراق جس وقت اپنے پڑوسی ملک پر چڑھائی کر رہا تھا اس وقت امریکی محکمہ توانائی کے ایک مشیر نے

اس حقیقت سے اعلیٰ افسروں کو آگاہ کیا۔ اس کے بعد اس کا تبادلہ کر دیا گیا۔ بش سینئر انتظامیہ کے ایک افسر نے اس وقت کہا کہ ہم ان کے ایٹم بم بنانے کے پروگرام سے آگاہ ہیں لیکن صدام حسین ہمارا اتحادی ہے۔ 1992ء میں امریکی کانگریس کی انکوائری میں یہ بات سامنے آئی کہ صدام حسین کی خفیہ حمایت اور تیسرے ملک کے ذریعے اسلحہ فراہم کرنے کے غیر قانونی کام کی مکمل پردہ پوشی کی جائے۔ کویت پر قبضہ کے بعد بھی امریکی سی آئی اے عراق کو بڑی تعداد میں انٹیلی جنس فراہم کر رہی تھی۔ صدر بش نے پہلے ظالم اور جابر افراد کی مدد کی۔ انہیں آلات سے لیس کیا اور برے وقت میں ان کی مدد کی۔ بعد ازاں انہیں ختم کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ تمام شواہد دفن کیے جا سکیں۔ اب وقت بدل چکا تھا۔ کئی سال سے دوستی کی آڑ میں مفاوات حاصل کرنے والا امریکہ اب دشمن کا روپ دھار چکا تھا۔ امریکہ اس موقعہ کو حاصل کرنے کا برسوں سے انتظار کر رہا تھا اور آخر کار ان کے بنائے ہوئے منصوبے کامیاب ہو گئے۔ اس طرح وہ عرب ریاستوں میں اپنے فوجی اڈے بنانے میں کامیاب ہو گیا اور تیل کی دولت پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ اس سارے منصوبے کے پیچھے دو وجوہات تھیں۔ ایک عرب ملکوں کے قدرتی وسائل پر قبضہ اور دوسرا اسرائیل کا تحفظ۔ کیونکہ اگر عراق ایٹمی طاقت بن جاتا تو اسرائیل کی چودھراہٹ ختم ہو جاتی۔

ایران عراق جنگ دنیا کی ان ہولناک جنگوں میں سے ایک ہے جنہوں نے عالمی سیاست اور اقتصادیات پر گہرے اثر ڈالے اور جب لوگ اس جنگ کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں تو وہ ناقابلِ یقین حقیقت سے حیران و پریشان رہ جاتے ہیں کہ دو مسلم ممالک ایک دوسرے کے خلاف اتنی تباہی مچا سکتے ہیں۔ اس جنگ نے دنیا کا نقشہ بدل ڈالا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ اور روس دو بڑی طاقتیں تھیں مگر وہ بھی ان جنگوں کو رکوانے میں ناکام رہے۔ لاکھوں لوگوں نے موت کو گلے لگایا اور کھربوں ڈالر کا نقصان ہوا۔ قدرتی وسائل سے مالا مال اور تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن یہ دونوں ملک اس بے مقصد جنگ کی وجہ سے اقتصادی و سماجی تباہی کے دھانے پر پہنچ گئے۔ ان کی آنے والی نسلوں کو بھی اس جنگ سے پیدا ہونے والی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ایران و عراق میں جنگ شروع ہونے کی ایک بڑی وجہ دونوں ممالک کے مابین دیرینہ سرحدی تنازعہ تھا جس کی تاریخ ۲۵ سالوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ عراق سولہویں صدی سے لے کر پہلی جنگ عظیم تک سلطنت عثمانیہ کا حصہ رہا اور اس کے بعد برطانیہ کے تسلط میں آ گیا۔ جب عراق آزاد ہوا تو شط العرب کا سرحدی تنازعہ اسے ورثہ میں ملا۔ ایران نے اس علاقہ کو اپنی ملکیت قرار دیا جبکہ [illegible]

ملکوں کا اس دریا پر مساوی حق تھا۔ اس دوران دونوں ملکوں کے دمیان سفارتی جنگ شروع ہو گئی۔ امریکہ دونوں ممالک کا حامی تھا۔ کیونکہ دونوں ملک امریکہ کے مفادات کے تحفظ کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ اس لیے امریکہ نہیں چاہتا تھا کہ ان کے درمیان جنگ ہو۔ مگر ایران کے انقلاب کے بعد امریکہ ایران کا دشمن ہو گیا اور عراق کی پشت پناہی شروع کر دی کہ وہ ایران پر حملہ آور ہو۔ اس بات کا ثبوت تاریخی حوالوں سے بھی ملتا ہے کہ یہ جنگ امریکہ اور ایران کے درمیان لڑی جا رہی تھی۔ امریکہ نے ایران کو پوری طرح جکڑ رکھا تھا اور اس پر امریکہ کی حکمرانی تھی۔

اب ہم امریکہ اور ایران کے تعلقات کا جائزہ لیتے ہیں۔

ایران میں اسلامی انقلاب بیسویں صدی کا اہم ترین واقعہ ہے۔ جس میں پہلوی خاندان کے 50 سالہ دور کا خاتمہ ہوا۔ اس انقلاب کے نتیجے میں عالمی طاقتوں کے ناقابل تسخیر ہونے کا تصور ختم ہو گیا کیونکہ دنیا کا کوئی بھی شخص یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ ایران جو امریکہ کی مرضی کے بغیر ملکی و عالمی سطح پر کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا اور اس کا وفادار حلیف تھا۔ وہ اس کے لیے عالمی سطح پر ذلت کا باعث بن جائے گا اور جہاں اس نے اپنی عالمی استعماریت کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے وسیع جال بچھایا، فوجی تنصیبات قائم کیں، خفیہ جاسوس ادارے بھی بنائے اور وہاں پر اپنی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے تمام ممکنہ اقدامات کیے، وہاں سے اسے بے سروسامانی کیساتھ نکلنا پڑے گا۔ اس طرح بھی کوئی نہیں سوچ سکتا تھا کہ ایران کا مغربی طرز کا معاشرہ جسے اسلامی معاشرے سے مغربی معاشرے میں ڈھالنے کے لیے پہلوی خاندان نے پچاس سالہ دور میں بے پناہ کوششیں کیں، غیر معمولی سرمایہ خرچ کیا اور اس کی جڑوں کو مضبوط کرنے کے لیے تمام اقدامات کیے، وہاں پر اسلامی انقلاب برپا ہو گا اور جہاں پر اسلام کی جڑوں کو کمزور کرنے کے لیے تمام حربے آزمائے گئے وہاں کے عوام اسلامی جذبے سے سرشار ہو کر اجتماعی شکل میں اس نظام کے نفاذ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے اور جدید ہتھیاروں سے لیس شاہ کی چار لاکھ فوج خفیہ تنظیم ساوک اور پولیس کے سامنے سینہ سپر ہو جائیں گے۔

شاہ ایران کے دور میں امریکہ کو ایران کی فوجی سیاست اور معیشت میں اہم حیثیت حاصل تھی اور امریکیوں کو ایران میں خصوصی مراعات حاصل تھیں۔ شاہ قومی پالیسیوں میں امریکہ کے مشوروں کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اور تیل سے حاصل ہونے والی آمدنی کا بیشتر حصہ امریکی درآمدات پر خرچ کیا جاتا۔ ایرانی معیشت پر امریکی تجارتی کمپنیوں کا تسلط تھا۔ ایران میں امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے کے متعدد

ذیلی ادارے قائم تھے جو ایران کے اقتدار اور اس خطے کے دوسرے ملکوں میں امریکہ کی جاسوسی کرتے تھے۔اس طرح ایرانی فوج اور افسر شاہی امریکہ کی جاسوسی کرتے تھے۔اس طرح ایرانی فوج اور افسر شاہی میں امریکی مشیر بڑی تعداد میں کلیدی عہدوں پر کام کرتے تھے۔علاوہ ازیں شاہ کے دور حکومت میں ایران امریکہ کی تجارتی منڈی اور نوآبادی بن گیا تھا۔شاہ کی خواہش تھی کہ وہ اپنے ملک کو مغربی ایشیا کی علاقائی طاقت بنائیں۔ان کی اس خواہش کی امریکی نے بھرپور تائید کی اور بڑے پیمانے پر ایران کو ہتھیار فروخت کیے۔ایک اندازے کے مطابق امریکی نے ایران کو شاہ کے دور میں تقریباً 75 ارب ڈالر کا اسلحہ فراہم کیا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ امریکہ کو رقم ایڈوانس میں دی جاتی تھی اور اسلحہ بعد میں فراہم کیا جاتا تھا۔مثال کے طور پر جب شاہ اقتدار سے علیحدہ ہوئے تو امریکہ کے پاس جمع شدہ ایرانی ایڈوانس کی رقم ۲۴۰ ملین ڈالر تھی۔امریکہ ہتھیار فراہم کرنے کا پابند تھا مگر انقلاب کے بعد دونوں ممالک میں حالات کشیدہ ہو گئے اور امریکہ نے ہتھیار دینے سے انکار کر دیا۔شاہ نے اپنے دور اقتدار میں امریکیوں کو مخصوص مراعات دیں۔وہ ایرانیوں کے ساتھ غیروں کا سا سلوک کرتا اور امریکہ کے باشندوں کو ان سے برتر تصور کرتا تھا۔شاہی خاندان کے لوگ زیادہ تر وقت یورپ اور امریکہ میں گزارتے تھے۔ان کی وہاں بڑی بڑی جائدادیں تھیں اور ان کے بینکوں میں اربوں ڈالر تھے۔شاہ امریکہ کے مفادات کے تحفظ کا بڑا حامی تھا۔اس لیے امریکہ چاہتا تھا کہ شاہ کا اقتدار قائم رہے۔

مثال کے طور پر ڈاکٹر مصدق نے ایران کی وزارت عظمیٰ سنبھالتے ہی تیل کی صنعت کو مغربی ممالک کی مخالفت کے باوجود قومی ملکیت میں لے لیا۔جس کے نتیجے میں وہ مقبول عوامی رہنما بن گیا اور عوام نے اس فیصلے کا بھرپور خیر مقدم کیا جس کے باعث شاہ کو 1953ء میں ملک چھوڑنا پڑا۔مگر بعد ازاں ایرانی فوج نے امریکی خفیہ تنظیم سی آئی اے کی مدد سے ڈاکٹر مصدق کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور شاہ دوبارہ برسراقتدار آ گیا۔اس دوران شاہ نے تمام اقدامات اسلام اور ملکی مفاد کے خلاف تھے۔اس نے بھاری صنعت کے فروغ کی مخالفت کی تاکہ ایران صنعتی مصنوعات کی امریکی منڈی بنا رہے۔اس طرح لوگوں میں بیروزگاری بڑھ گئی اور وہ احساس محرومی کا شکار ہو گئے۔

اسی طرح وہ مسلمانوں کے جذبات کے بھی خلاف اقدامات کرتا تھا۔اس کا رجحان اسرائیل کی طرف ہونے کی وجہ سے تمام مسلم ممالک میں اس کو ناپسند کیا جاتا تا۔اس نے 1958ء میں عرب اور مسلم ممالک کی مخالفت کے باوجود اسرائیل کو تسلیم کیا۔اسی طرح عربوں اور سرائیل کے درمیان

1948ء، 1956ء اور 1973ء کی جنگوں میں بھی اس نے مسلمان بھائیوں کی کوئی مدد نہ کی جس کی وجہ سے اسے شک کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔

شاہ نے ملک کو سیکولر سٹیٹ بنا دیا اور مذہبی لیڈروں پر مختلف پابندیاں عائد کر دیں، جس کی وجہ سے مذہبی حلقوں میں شدید غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور بالآخر یہ تمام زیادتیاں انقلاب کی شکل اختیار کر گئیں۔ انقلابیوں نے گیارہ فروری 1979ء کو حکومت کے تمام کاروبار پر قبضہ کر لیا۔ 76 سالہ امام خمینی کو ایرانیوں نے اپنا لیڈر مانا اور انہیں اپنا نجات دہندہ تصور کرنے لگے۔

شاہ کے خلاف جیسے جیسے تحریک زور پکڑتی گئی، ایران اندرونی طور پر کمزور ہوتا گیا اور شاہ کی توجہ بیرونی دنیا سے ہٹ کر داخلی مسائل کی طرف ہو گئے۔ ان حالات میں عراق نے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاہ پر دباؤ بڑھا دیا۔ وہ معاہدہ الجزائر میں ترمیم کر کے شط العرب پر مکمل کنٹرول چاہتے تھے۔ عراقی صدر صدام کا کہنا تھا کہ ۱۹۷۵ء کا معاہدہ ان پر مسلط کیا گیا تھا اور اس نے مجبوری کی حالت میں اس پر دستخط کیے تھے۔ مگر شاہ نے ان کا مطالبہ مسترد کر دیا اور انقلاب کے بعد عراقی صدر نے امام خمینی کی حکومت پر بھی اسی مسئلے پر زور دیا جس کو انقلابی حکومت نے ماننے سے انکار کر دیا اور یوں جنگ یقینی ہو گئی۔ مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ پچھلے چار سال سے عراقی اس کا مطالبہ کر رہے تھے مگر وہ خود کو حالت جنگ تک نہ لائے تو اچانک حالات میں اتنی سنگینی کیسے آ گئی؟ اس کی وجہ بالکل صاف ہے کہ امریکہ کو انقلابیوں نے ایران سے نکال کر ان کے وسائل پر قبضہ کر لیا اور جو خواب امریکہ دیکھ رہا تھا کہ ایران میں بیٹھ کر تمام ایشیا کا کنٹرول سنبھالے گا، اس کو خاک میں ملا دیا۔ اس لیے ہم واضح الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ جنگ ہرگز ایران وعراق کی جنگ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کے خدوخال سے ہی نہیں بلکہ حقائق اور شواہد کی بنیاد پر بھی یہ جنگ ایران اور امریکہ کے درمیان لڑی جا رہی تھی۔ ان حوالوں کے علاوہ امریکہ کے 29 بحری جنگی جہازوں کی موجودگی جن پر کم و بیش پندرہ ہزار فوج جدید ترین آلات اور اسلحے کے ساتھ موجود تھی۔ ایک عرصے سے نہ صرف عراق کو جنگی اہمیت کی اطلاعات فراہم کر رہی تھی بلکہ خود بھی ایران کے خلاف جارحیت کی مرتکب نظر آتی تھی۔

امریکہ کے سابق صدر رچرڈ نکسن نے ویت نام سے سیکھے ہوئے سبق اور حاصل کیے ہوئے تجربے کی بنیاد پر جو حکمت عملی وضع کی تھی وہ یہ تھی کہ امریکہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے بنفس نفیس کسی جنگ میں ملوث نہ ہو بلکہ بالواسطہ جنگی کارروائیوں پر انحصار کرے۔ مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کو عربوں اور

فلسطینیوں کے خلاف لبنان میں لبنان کے عیسائیوں کو لبنان کے مسلمانوں کے خلاف، پاکستان کو سوویت یونین کے خلاف افغانستان میں، ہنڈورس میں سموزا کے وفاداروں کو نکاراگوا کے خلاف اور عراق کو ایران کے خلاف استعمال کرنے کی پالیسی اسی حکمت عملی کے مطابق تھی۔ یہ امریکہ ہی ہے جس نے ایران پر عراقی حملہ کو جائز قرار دیا اور جنگ بندی کے لیے ایران کی ایک ہی شرط تھی کہ عراق کی جارحیت کی مزمت کی جائے۔ اگر امریکہ اس جنگ کو بند کروانے کے حق میں اتنا ہی مخلص تھا تو یہ جنگ بہت اور بہت سی تباہی سے پہلے بند کروائی جاسکتی تھی۔ اقوام متحدہ کے فورم سے یہ رسمی کارروائی ممکن بنائی جاسکتی تھی۔ اقوام متحدہ خود امریکہ کی لونڈی کا کردار ادا کر رہی ہے۔ اسی عرصہ میں اگر امریکہ سوویت یونین کے افغانستان میں داخلے پر اقوام متحدہ میں قرارداد مذمت منظور کروا سکتا ہے تو پھر ایران پر عراقی حملے کی مذمت کروانے میں کیا مشکلات حائل تھیں۔ امریکہ کی حکمت عملی اس جنگ کو طوالت دینے کی تھی۔ امریکہ نہ صرف یہ کوشش کر رہا تھا کہ اس جنگ کو مسلمان دنیا میں فرقہ واریت کی آگ بنا کر منتقل کروں جیسا کہ پاکستان میں شیعہ سنی اور عرب میں اس جنگ کو عرب وعجم کی جنگ قرار دیا جائے۔ بلکہ وہ اس آڑ میں اپنے اسلحے کی فروخت کو خوب فروغ دے رہا تھا۔ کیونکہ اس جنگ سے تمام عرب ممالک اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتے تھے اور سب نے اسلحہ خریدنے کے لیے امریکہ سے رجوع کیا۔ جس نے اسلحہ کی فروخت سے اربوں ڈالر کا کاروبار کیا۔ اس جنگ کی وجہ سے خلیج کا علاقہ اسلحہ کی منڈی میں تبدیل ہو گیا اور تیل سے حاصل ہونے والی آمدنی کا بیشتر حصہ تیل پیدا کرنے والے ممالک نے اسلحہ کی خریداری پر صرف کیا۔ اسلحہ تیار کرنے والے ممالک نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے بھاری قیمت وصول کی۔ اسلحہ کی خریداری میں سعودی عرب پہلے نمبر پر رہا۔ اس نے 1984ء میں سب سے زیادہ اسلحہ فرانس سے خریدا جس کی ملکیت 3.35 ارب ڈالر تھی۔ اسی طرح ستمبر 1986ء میں سعودی عرب نے برطانیہ سے 5.7 ارب ڈالر کے جنگی وتربیتی جہاز خریدنے کا سودا کیا۔ اس نے اپریل 1987ء میں بھی امریکہ کی اسلحہ ساز کمپنی سے 3.9 ارب ڈالر کا معاہدہ کیا۔ 1985ء میں کویت نے اپنے فضائی نظام کو مضبوط بنانے کے لیے روس سے 103 ارب ڈالر کا سامان خریدا۔ اسی سال اگست میں کویت کے وزیر دفاع نے ماسکو کا دورہ کیا اور میزائل خریدنے کے معاہدے پر دستخط کیے۔ ان میزائلوں کی قیمت اربوں ڈالر بیان کی جاتی ہے۔ اسی طرح امریکہ نے 1983ء سے 1984ء تک 3.50 ارب ڈالر کے ہتھیار کویت کو فروخت کیے۔ ایران وعراق نے اپنے تیل کی برآمد سے حاصل ہونے والی آمدنی کی

75 فیصد رقم اسلحہ کی خریداری پر خرچ کی۔ فرانس نے 1980ء سے لے کر 1983ء تک تین سالوں کے دوران عراق کو 5.6 ارب ڈالر کا اسلحہ فروخت کیا۔ اس طرح امریکہ اور دوسری بڑی طاقتوں نے دو اسلامی ممالک کو آپس میں لڑوا کر اسلحہ کی فروخت سے اربوں ڈالر کا فائدہ اٹھایا اور یہ جنگ فتح و شکست کا دامن چھوئے بغیر ہی ختم ہو گئی۔

اس جنگ کے بعد دونوں ممالک دفاعی لحاظ سے کافی کمزور ہو گئے۔ اور یہی امریکہ کا خواب تھا کیونکہ یہ دونوں ممالک دفاعی لحاظ سے کافی مضبوط تھے اور اسرائیل کو بھی ان ہی ممالک سے خوف تھا۔ مگر غیر مسلم طاقتوں نے مل کر انکی طاقت کو بڑی ہوشیاری سے ختم کروادیا۔ جس کا نقصان عراق کو کویت پر حملہ کے وقت ہوا۔ جب اتحادیوں نے ان کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

اس جنگ نے دونوں ممالک کی معیشت کو تقریباً تباہ کر کے رکھ دیا اور ان کی اقتصادی، سیاسی، سماجی ڈھانچوں کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

اس خطرناک جنگ سے قبل دونوں ممالک اس خطے کے مضبوط ترین ملکوں میں شمار کیے جاتے تھے مگر جنگ کے اختتام پر وہ اس خطے کے دفاعی لحاظ سے کمزور اور مالی لحاظ سے غریب ممالک میں شمار ہونے لگے۔ دونوں ممالک کی نوجوان نسل کی بڑی تعداد اس جنگ کی نظر ہو گئی۔ اس جنگ نے دونوں ملکوں کو پچاس سال پیچھے دھکیل دیا۔ جنگ کے دنوں میں ان ملکوں کی تیل کی پیداوار کروڑوں میں تھی جو جنگ کے بعد چند لاکھوں تک محدود ہو گئی اور ان کی قومی آمدنیوں میں غیر معمولی کمی واقع ہوئی۔ اس جنگ میں زیادہ نقصان عراق کو ہوا کیونکہ سمندر کے راستے اس کی تیل کی برآمد مکمل طور پر رک گئی اور اسے جنگی اخراجات پورے کرنے کے لیے دوسرے دولت مند عرب ملکوں سے قرضے لینے پڑے اور دوسرے ملکوں کے راستے تیل برآمد کرنے کے لیے تیل کی پائپ لائنیں بچھانے پر اربوں ڈالر خرچ کرنا پڑے۔

جنگ سے قبل عراق 33 لاکھ بیرل تیل یومیہ برآمد کر رہا تھا جو 1981ء میں کم ہو کر صرف سات لاکھ بیرل یومیہ ہو گیا اور تیل کی یہ مقدار عراق نے ترکی اور شام کے راستے پہلے سے بچھی ہوئی پائپ لائنوں کے ذریعے برآمد کی۔ عراق نے 1981ء میں پانچ لاکھ استعداد رکھنے والی نئی پائپ ترکی کے راستے تیل برآمد کرنے کے لیے بچھائی۔ یہ جولائی 1981ء میں مکمل ہوئی۔ اس طرح سعودی عرب کے راستے تیل برآمد کرنے کے لیے پائپ لائن بچھائی۔ یہ جولائی 1980ء میں مکمل ہوئی۔ سعودی عرب نے ایک اور پائپ لائن بچھانے کی اجازت دے دی۔ جس کی تکمیل سے عراق کے تیل کی برآمد

کی استعداد بذریعہ پائپ لائنوں کے 32لاکھ بیرل یومیہ ہوگئی۔اس طرح اس کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوا۔1984ء میں عراق نے تیل کی برآمدات سے صرف 14ارب ڈالر کمائے جو 1981ء میں بڑھ کر 10ارب ڈالر ہوگئی۔عراق اس برآمدات سے کافی حد تک مستحکم ہوا اور وہ جنگی و ترقیاتی اخراجات اپنے وسائل سے پورے کرنے لگا۔لیکن اس کے باوجود 1988ء تک اس کے ذمہ واجب الادا بیرونی قرضہ 05ارب ڈالر تھا۔جس میں 90فیصد رقم خلیج کی ہی دولت مند ریاستوں نے فراہم کی تھی۔

صدام حسین نے 2اگست 1990ء کو کویت پر ٹینکوں، جہازوں اور فوجی دستوں کے ساتھ بھرپور حملہ کردیا اور کویتی فوج کے معمولی دفاع کو روندتے ہوئے خلیج فارس کی تیل سے مالا مال ریاست پر قبضہ کرلیا۔صدام حسین کے اصل ارادوں کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔امریکہ اور اقوام متحدہ کیساتھ ساتھ اقوام عالم کے لیڈر بھی اس حملہ کی مذمت کررہے تھے۔امریکہ نے اپنے جنگی تیاریوں کو خلیج کی طرف جانے کا حکم دے دیا اور یہی وہ خواب تھا جس کی تعبیر کے لیے وہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے کوشاں تھا کہ مشرق وسطی کی ریاستوں میں اپنے فوجی اڈے بنائے اور آج یہ خواب صدام حسین کی مدد سے اپنی تکمیل کو پہنچا۔متعدد عرب ممالک میں امریکہ نے اپنے فوجی اڈے بنالیے جو آج تک قائم ہیں اور اس طرح وہ ان ممالک کے دفاع کی آڑ میں ان ممالک کو اربوں ڈالر کا مقروض کرچکا ہے اور تیل سے مالا مال اس خطے کو اپنی تحویل میں لے رکھا ہے۔

25ستمبر 1990ء کو سوویت یونین نے عراق کی کویت کے خلاف جارحیت پر اقوام متحدہ سے سخت ردعمل کی تائید کرتے ہوئے سلامتی کونسل میں عراق کے خلاف بحری ناکہ بندی کے ساتھ ساتھ فضائی ناکہ بندی کے حق میں ووٹ دیا۔جس کا مقصد عراق کے خلاف پابندیاں عائد کرنا تھا۔اس کے علاوہ ماسکو نے عراق کے خلاف اقوام متحدہ کی ممکنہ فوجی کارروائی پر رضامندی بھی ظاہر کی۔دونوں سپر طاقتوں کی عراق کے خلاف متفقہ پالیسی اور سعودی عرب میں عراق مخالف فوج ہونے کے باوجود صدام کے رویے میں کوئی تبدیلی یا لچک نہ آئی تو بالآخر 17جنوری 1991ء کو اتحادیوں کی مسلسل اور زبردست بمباری اور میزائلوں کے حملے سے بغداد کانپ رہا تھا۔آپریشن ڈیزرٹ اسٹارم رات اس وقت شروع ہوا جب F117 stealth fightor نے صدام حسین کے ٹیلی کمیونیکیشن کی مرکزی عمارت کو لیزر شعاعوں کا ہدف بنایا اور اسے دو ہزار پاؤنڈ کے ''اسمارٹ بم'' سے تباہ کردیا۔اس حملے کے بعد Toma Hawk کروز میزائل خلیج میں مقیم امریکی جنگی جہازوں سے چھوٹے اور صدام کے محل اور محکمہ دفاع کے

ہیڈ کوارٹروں کو نشانہ بنایا۔ امریکی نیوی کے Prowler اور ایئر فورس کے Raven نے عراقی ریڈار کے ڈیفنس کو مفلوج کر دیا۔ جبکہ Harm میزائلوں میں اینٹی ایئر کرافٹ بیٹریوں کو تباہ کر دیا۔ نیوی کے بمبار طیاروں نے بحیرہ قلزم میں موجود طیارہ بردار جہازوں سے پرواز کر کے حملے میں حصہ لیا اور B-52 طیاروں نے عراقی فوجوں کے ٹھکانوں پر بموں کا قالین بچھا دیا۔ ان طیاروں کے پیچھے پیچھے لڑاکا طیارے عراقی Mig-29 جہازوں کا صفایا کرنے کے لیے لپکے اور جو فضا میں اڑنے کی ہمت کر پائے تباہ کر دیئے گئے۔ اس تھوڑے سے وقت میں اتحادیوں نے 1300 فضائی حملے کر کے اتحادیوں نے عراق کے دفاع کو بری طرح تباہ کر دیا۔ آخرکار 28 فروری کو صدر بش نے ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

"کویت آزاد ہو چکا ہے اور عراقی فوج شکست کھا چکی ہے۔ مجھے یہ اعلان کرتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ آج آدھی رات کے وقت زمینی آپریشن کے ٹھیک سو گھنٹے اور آپریشن ڈیزرٹ اسٹارم کے آغاز کے چھ ہفتے بعد امریکہ اور اتحادی فوجیں اپنا آپریشن ختم کر دیں گی۔"

اس طرح عراق کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ان پر دوسری شکست پابندیوں کی شکل میں لاگو کر دی گئیں۔ اب ہم پابندیوں سے ہونے والی تباہی پر ایک نظر دوڑائیں گے۔

18 ماہ کے عرصے میں امریکی فضائیہ اور بحریہ کے طیاروں نے عراق پر 36 ہزار حملے کیے جس میں 24 ہزار لڑاکا مشن بھی شامل تھے۔ 1999ء کے دوران برطانوی اور امریکی طیاروں نے اٹھارہ سو بم برسائے اور ساڑھے چار سو اہداف نشانہ بنایا۔ اس طرح برطانوی عوام پر 800 ملین پونڈ کا بوجھ پڑا۔ تقریباً روزانہ بمباری کی گئی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ اینگلو انڈین فورسز کی طویل ترین فضائی مہم تھی۔ تاہم امریکہ اور برطانیہ کے ذرائع ابلاغ نے اسے نظر انداز کیا امریکہ 1991ء سے قبل جیسے صدام حسین کا خواہاں تھا جس نے ماضی میں امریکہ کی ہر خواہش پوری کی امریکہ اور برطانیہ نے وہاں کی عوام کے جذبات سے کھیلتے ہوئے ان کا شاندار استعمال کیا۔ امریکہ کو شیعہ اکثریت کا کوئی خیال نہ تھا اور نہ ہی کردوں کی آزادی سے کوئی ہمدردی تھی۔ اس کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ کردوں اور شیعوں کو مضبوط رکھا جائے تاکہ صدام حسین کے لیے مسائل پیدا ہوتے رہیں۔ جبکہ صدام حسین بھی مضبوط رہے تاکہ وہ انہیں کچل سکے لیکن جنگ سے زیادہ تباہی عراق پر پابندیاں لاگو کرنے سے ہوئیں جس کی وجہ سے لاکھوں عراقی خوراک اور دوائیوں کی قلت کی وجہ سے موت کا شکار ہوئے جن کی چند مثالیں یہ ہیں:

1990ء میں عراق پر لگنے والی پابندیوں کے باعث عراق کو ایسے آلات حاصل کرنے کا حق نہیں تھا جس کی وجہ سے آلودگی ختم کی جاسکے۔ حالانکہ کویت کو یہ سہولت مہیا کی گئی اور اسے خلیج کی جنگ کے بعد خود امریکہ نے آلودگی سے پاک کیا۔ اس آلودگی کی وجہ سے عراق میں بیماریاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ عراق میں بہت سے لوگوں کے جسموں میں تابکاری کی سطح پانچ ہزار گنا زیادہ تھی۔ افزودہ یورینیم کی آلودگی پورے عراق اور کویت میں پھیل گئی تھی۔ اس کے اثرات کا انحصار اس بات پر تھا کہ کسی فرد نے اس کی کتنی مقدار بدن میں جذب کی تھی۔ اس وقت لوگوں کو سانس، گردے اور کینسر کی جو بیماریاں تھیں وہ امریکی اسلحہ کا براہ راست نتیجہ تھا۔ اگست 1990ء میں کویت پر عراق کے قبضے کے بعد خوراک سمیت تمام درآمدات پر آٹھ ماہ کے لیے موثر پابندی عائد کر دی گئی۔ حالانکہ سلامتی کونسل نے 6 اگست 1990ء کی قرارداد نمبر 661 میں خوراک اور ادویات کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا تھا۔ اقوام متحدہ نے کئی برس تک عراق کو اپنے فنڈ میں اضافہ کی بھی اجازت نہیں دی۔ عراق تقریباً تمام تمام اشیاء درآمد کرتا تھا، اس لیے اس کے فوری اثرات مرتب ہوئے۔

یونیسیف کے ایک جائزے کے مطابق 1991ء کے دوران پانچ سال سے کم عمر کے تقریباً پانچ لاکھ بچے لقمہ اجل بنے۔ یہ متوقع تعداد سے کافی زیادہ ہے۔ ان میں سے بہت سے بچوں کا علاج ممکن تھا۔ اب عراق میں 167 بچے روزانہ کے حساب سے موت کا شکار ہو رہے ہیں۔ اگر ان میں بڑوں کی تعداد بھی شامل کر لی جائے تو ان کی تعداد دس لاکھ ہو جائیگی۔ 1999ء میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے ایک پینل نے اپنی رپورٹ میں بتایا۔ کہ عراق میں غربت بڑھ رہی ہے اور سلامتی کونسل کے اقدامات سے عراقی بچے متاثر ہو رہے ہیں۔ شیر خوار بچوں کی شرح اموات تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ 1990ء سے قبل عراق ان ممالک میں شامل تھا جہاں شیر خواروں کی شرح اموات سب سے کم تھی جو اب سب سے زیادہ ہے۔ عراق میں بچوں کی شرح اموات میں تین گنا اضافہ ہوا ہے اور جدید دنیا میں پانچ سال سے کم عمر بچوں کی ہلاکت کی شرح میں اس تیزی سے اضافہ کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

اقوام متحدہ کے ذریعے عراق کے عوام اور بچوں سے جنگ کی جا رہی تھی۔ اس کے نتائج ناقابل یقین تھے جن کی جنیوا کنونشن کی روشنی میں قطعاً توقع نہیں کی جا سکتی کیونکہ شہری آبادی کو نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ یہ صورتحال اس وقت زیادہ تشویشناک ہو جاتی ہے جب بے گناہ بچے بھی پابندیوں کا شکار ہو رہے تھے۔ یہ بچے عراق پر حملے کے وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ یہ صورت حال اقوام متحدہ مغربی دنیا اور تمام

جمہوری ممالک کے لیے نہایت شرمناک اور انسانیت سوز ہے۔ یہ ایک ایسی پالیسی تھی جس کا مقصد ۱۰ لاکھ سے زیادہ افراد کو ہلاک کرنا تھا۔ درحقیقت ان پابندیوں کی قیمت صدام حکومت نہیں، بلکہ عراق کی عوام چکا رہے تھے۔ غریب لوگ اپنے بچوں اور بچے اپنے والدین سے محروم ہو رہے تھے۔ ایک اور بات واضح تھی کہ سلامتی کونسل آؤٹ آف کنٹرول ہونے کے باعث اس کے اقدامات اقوام متحدہ کے چارٹر انسانی حقوق کے اعلامیہ اور جنیوا کو نقصان پہنچا رہے تھے۔ 1996ء سے جاری اس پروگرام کے تحت عراق کو خوراک خریدنے کی غرض سے اپنے تیل کی پیداوار کا کچھ حصہ فروخت کرنے کی اجازت تھی۔ اس تیل سے ہونے والی آمدنی براہ راست جس اکاؤنٹ میں جمع ہوتی تھی اسے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کنٹرول کرتی تھی۔ اس آمدنی کا ایک تہائی حصہ امداد پر خرچ ہونے کی بجائے اقوام متحدہ پر خرچ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کمپنیوں، ملٹی نیشنل کارپوریشنوں اور کویت کو بھی ادائیگی کی جاتی تھی۔

خوراک اور ادویات فنی طور پر پابندیوں سے مستثنیٰ نہیں تاہم پابندیوں سے متعلق کمیٹی نے بار بار ویٹو کیا اور بے بی فوڈ، ذریعہ آلات، دل اور کینسر سے متعلق آکسیجن ٹینٹس، ایکسرے مشینوں کی فراہمی سے متعلق درخواستیں تاخیر کا شکار ہوئیں۔ دل و پھیپھڑوں سے متعلق 16 مشینیں روک لی گئیں۔ ان کا جواز تھا کہ ان میں کمپیوٹر چپ لگی ہوئی ہے۔ اسی طرح ایمبولینسوں کا بیڑہ روک لیا گیا۔ اس اقدام کا جواز ان میں لگے ویکیوم فلاسک تھے۔ ان فلاسک میں ادویات رکھی جاتی ہیں تاکہ ٹھنڈی رہیں۔ اکتوبر 2001 تک اس کمیٹی نے 3.85 ارب ڈالر کی ملکیت کے 1010 کنٹریکٹس رد کیے۔ اس میں صحت، خوراک، پانی، صفائی، زراعت اور تعلیم وغیرہ سے متعلق اشیا تھیں۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے بیشتر ارکان یہ پابندی ختم یا معقول حد تک نرم کرنے کے حق میں تھے۔ فرانس نے ان پابندیوں کو ظالمانہ اور خطرناک قرار دیا۔ تاہم امریکہ اور برطانیہ کی بالادستی کے باعث کنٹریکٹس روک لئے گئے۔

اس کے بعد جب امریکہ نے محسوس کیا کہ عراقی عوام اتنی مشکلات اور تکالیف کے باوجود بھی صدام کے خلاف آواز بلند نہیں کرتے اور بڑی بہادری سے ان آزمائشوں کا مقابلہ کر رہے ہیں تو اس نے یہ شور مچانا شروع کر دیا کہ عراق کے پاس مہلک ہتھیار ہیں جو وہ دوسرے عرب ممالک اور خاص طور پر اسرائیل کے خلاف استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کے بعد ہمیشہ کی طرح امریکی پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا نے عراق کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا اور اس پر حملے کے لیے راہ ہموار کرنے لگے۔ لیکن اس دوران امریکہ کو تب مایوسی ہوئی جب عراق نے اسلحہ انسپکٹروں کو معائنے کی اجازت دی اور امریکہ

اپنے اتحادیوں سمیت افغانستان میں بھی حالت جنگ میں تھا۔ اسی طرح اقوام متحدہ اور پوری دنیا نے عراق پر حملے کی واضح الفاظ میں مذمت کی۔ مگر امریکہ گیارہ ستمبر کے واقعہ کی کڑیاں عراق سے ملانا شروع ہو گیا اور صدام اور اسامہ کے آپس میں تعلق کے متعلق ایک نئی بحث شروع ہو گئی۔ اسلحہ انسپکٹروں نے عراق کو مہلک ہتھیاروں سے پاک ملک قرار دیا۔ مگر امریکہ اپنی ہٹ دھرمی پر ڈٹا رہا۔ عراق کے علاوہ ایران اور شمالی کوریا پر بھی جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ ان دونوں ممالک پر بھی انسانی تباہی کے ہتھیاروں کا معاملہ اٹھایا مگر ان دونوں ممالک سے توجہ ہٹا کر تیل سے مالا مال ملک عراق پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس پر ساری دنیا ایک طرف اور بش چند اتحادیوں کے ساتھ ایک طرف تھا۔ صدر بش نے انسانی خون سے تیل کی قیمت زیادہ بڑھا دی۔ ساری دنیا سراپا احتجاج بن گئی۔ لوگ لاکھوں کی تعداد میں سڑکوں پر آ گئے۔ اقوام متحدہ کی اجازت کے بغیر بش نے عراق کو بھی افغانستان جیسے حالات سے نبٹنے کے لیے پیشگی دھمکی دیدی۔ اس منصوبے کے پیش نظر 30 جنوری 2003ء کو عراق کے گرد علاقے میں امریکی جنگی طیارے اتار لیے گئے۔ اس کے علاوہ دوسرے کئی عرب ممالک میں اس کی فوج پہلے سے موجود تھی۔ امریکہ کا ساتھ دینے کے لیے برطانوی فوج بھی پہنچ گئی۔ اسی دوران صدر بش نے عراقی صدر صدام حسین کو الٹی میٹم دیا کہ وہ 48 گھنٹوں کے اندر ملک چھوڑ دے اور اصرار کیا کہ صدام کے ایسا کرنے کے باوجود بھی امریکہ عراق میں تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی تلاش میں داخل ہوگا۔ اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ امریکی فوج کا مقصد عراق میں کسی قسم کے ہتھیاروں کی تلاش نہیں بلکہ تیل سے مالا مال اس ملک کے وسائل کو اپنی تحویل میں لینا تھا۔ صدام کے ڈیڈ لائن مسترد کرنے پر امریکہ نے 19 مارچ 2003ء کو عراق پر حملہ کر دیا۔

پچھلے کئی سالوں سے اندرونی خانہ جنگی، ایران اور کویت سے جنگ اور پابندیوں سے تھکی ہاری قوم پر جنگ مسلط کر دی گئی۔ نتیجہ سب کو معلوم تھا۔ اس دوران ہولناک بمباری سے عراقیوں کو تباہ و برباد کیا جا رہا تھا۔

عراق پر حملہ کے لیے خطہ میں پہلی خلیجی جنگ سے لے کر اب تک کافی فوج موجود تھی۔ تاہم امریکہ نے مزید وار شپ اور آرمی کے کئی ڈویژن روانہ کرنا شروع کر دیئے تھے۔ جن میں امریکہ کا اتحادی برطانیہ بھی شامل تھا۔ اور بالآخر امریکہ 20 مارچ 2003ء کو اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر اور جدید اسلحہ سے لیس فوج کی مدد سے عراق پر حملہ آور ہو گیا۔ اتحادی فوجوں کی تعداد ایک لاکھ نوے ہزار سے

زیادہ تھی۔ حملہ تین اطراف سے کیا گیا کویت عراق سرحدی کی طرف سے۔ ترکی کرد علاقوں کی سرحد سے، عراق اور امریکی فوج کا عسکری نقطۂ نظر سے کوئی بھی موازنہ نہیں تھا۔ ایک طرف امریکہ اپنے اتحادیوں کے ہمراہ جدید ترین جنگی مشینری جن میں جدید لڑاکا طیارے، بحری جہاز، بحری بیڑے، میزائل اور خطرناک بم شامل تھے، سے لیس تھا اور دوسری طرف عراق ایک طویل عرصہ کی پابندیوں کے باعث کسی قسم کا جدید اسلحہ نہ رکھتا تھا۔ زیادہ تر اسلحہ ساتھ اور ستر کی دہائیوں کا روسی ساختہ تھا جن میں سے بیشتر کی معیار پوری ہو چکی تھی یا پھر ری بلڈ اور اور استعمال نہ ہونے اور پرزے نہ ملنے کی وجہ سے استعمال کے قابل نہ تھا۔

اتحادیوں کے پاس سات سو سے زیادہ لڑاکا طیارے تھے جبکہ عراقی فضائیہ چند درجن پرانے روسی ساختہ طیاروں پر مشتمل تھی۔ جو نوے فیصد سے زیادہ فضا میں اڑنے کے قابل نہ تھے۔ عراقی آرمی جو زیادہ تر ریپبلکن گارڈز پر مشتمل تھی اور ان کی تعداد ایک لاکھ چالیس ہزار کے قریب تھی اور وہ بھی پرانی طرز کی کلاشنکوفوں اور رائفلز کیساتھ اس کے برعکس اتحادی فوج جدید ترین اسلحہ سے لیس تھی۔ جنگ کے شروع کے دنوں میں عراقی آرمی نے اتحادی فوجوں کو بصرہ اور ام القصر میں شدید مزاحمت کے بعد کئی دن تک روکے رکھا۔ امریکن سنٹرل کمانڈ کے چیف ٹومی فرینکس نے حکمت عملی بدلی اور جنگ ایک نئی طرز اختیار کر گئی۔ اتحادیوں نے بغداد سمیت دوسرے اہم شہروں میں بعث پارٹی کے اہم دفاتر اور مراکز پر کروز میزائلوں کی بارش شروع کر دی۔ عراق کا بھاری نقصان ہوا اور بالآخر اتحادی فوج ۱۰ اپریل کو بغداد میں داخل ہو گئی اور صدام کی حکومت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ جنگ میں ہزاروں لوگ قتل اور اپاہج ہوئے۔

21 اپریل 2003ء کو جنرل جے گارنر نے عراق کا نظم ونسق سنبھالا۔ اس کے بعد گارنر کی جگہ پال بریمر کو عراق کی عبوری انتظامی کونسل کا سربراہ اور ملک کا منتظم اعلیٰ بنایا گیا۔ اس کے بعد ملک میں گوریلا جنگ، خودکش حملے اور اغوا کی وارداتوں میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔

جنگ کے دوران ہی صدام حسین اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ روپوش ہو گئے اور پھر 24 جولائی 2003ء کو پہلی مرتبہ امریکی فوجیوں کی طرف سے دو داڑھی والے افراد کی خون میں لت پت لاشوں کی تصاویر دکھائی گئیں۔ اگلے روز امریکی فوجیوں نے اخباری نمائندوں کو عدی اور قصی کی لاشوں کی ویڈیو دکھائی جو بغداد کے آرمی ایئر فورس کے ایک مردہ خانہ میں بنائی گئی تھی۔ ان دونوں کی ہلاکت کے بعد

میں جہاں کہا گیا کہ وہ دونوں بھائی پہلے سے ہی امریکی حراست میں تھے وہاں بعض نے کہا کہ یہ دونوں بھائیوں کے ہم شکل ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے باپ کی طرح ہم شکل افراد رکھنے میں مشہور تھے۔ 22 جولائی کو دونوں بھائی اور عدی کا 14 سلہ بیٹا مصطفیٰ اپنے باڈی گارڈ کے ہمراہ امریکی فوج سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ امریکہ نے ان دونوں کے بارے میں اطلاع فراہم کرنے والے کے لیے 30 ملین ڈالر کا انعام رکھا تھا۔ امریکہ نے ان کے مخبر اور میزبان جس کے پاس یہ پچھلے 22 دن سے تھے کو 30 ملین دیکر عراق سے باہر منتقل کر دیا۔ اس کے علاوہ دونوں بھائیوں سے جو 100 ملین ملے تھے وہ بھی اس کو دے دیئے گئے۔ امریکیوں کے نزدیک یہ ایک بڑی کامیابی تھی مگر ان کو اصل کامیابی 13 دسمبر 2003ء کی شام کو تب ملی جب امریکی افواج نے عراقی صدر صدام حسین کو اس کے قریبی عزیز کی مخبری پر اس فارم ہاؤس کا گھیراؤ کیا اور صدام حسین کو گرفتار کر لیا۔

صدام حسین اس وقت ایک تہہ خانہ میں حالت نیند میں تھے۔ گرفتاری کے وقت صدام حسین نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا ''میں عراقی صدر صدام حسین ہوں اور اعلیٰ حکام سے مذاکرات کرنے کے لیے گرفتاری پیش کرتا ہوں'' گرفتاری کے وقت صدام حسین کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ ان کی گرفتاری کی اطلاع امریکی منتظم اعلیٰ پال بریمر نے کہا کہ "Ladies and Gentlemen We got Him" اس طرح صدام حسین کی کہانی اختتام کو پہنچی۔ اصل میں یہ وہی شخص ہے جس کو امریکہ کی مدد حاصل رہی اور انہیں کی مہربانیوں سے صدام حسین اقتدار تک پہنچا۔ اس کے بعد اس نے بھی امریکہ کی ہر خواہش کے سامنے سر جھکایا۔ امریکہ کے اشارے پر ایران پر حملہ کر دیا اس کے بعد کویت پر حملہ کر کے امریکہ کو مشرق وسطیٰ میں قدم جمانے کا جواز دیا۔ 90ء کے بعد سے یہ امریکہ کی پابندیوں سے آزاد ہونا چاہتا تھا مگر امریکہ نے اسے قبول نہ کیا اور آخر کار اس کی تباہی کا سامان کیا۔ عرب دنیا بالخصوص مشرق وسطیٰ اور عراق میں تاریخ جس تیزی سے چولا بدل رہی ہے اور علاقے کے خدوخال بگڑ رہے ہیں، یہ کہنا زیادہ مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ خطہ اپنی موجودہ شکل برقرار نہ رکھ سکے گا۔ صدام حسین پر مقدمہ عرب تاریخ میں اپنی نوعیت کی ایک ایسی مثال ہے، جس کی نظیر ڈھونڈنے سے نہ ملے گی۔ صدام حسین جیسے شخص کو مقدمہ کا سامنا جو اسرائیل اور خطے میں مغرب کے مسلط کیے جانے والے مفادات اور خواہشات کی تکمیل میں عرب مزاحمت کی علامت اور دیوار سمجھا جاتا تھا۔ صدام حسین طویل عرصہ تک عراق کے بلا شرکت غیر حکمران رہے ہیں۔ اس دوران انہوں نے اقلیتوں اور اپنے ہی عوام پر انسانیت سوز مظالم

ڈھائے۔ ایران سے جنگ چھیڑی اور کویت پر قبضہ کیا۔ ان تمام باتوں نے انہیں ایک ظالم جابر اور بے رحم حکمران کا روپ دیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ ایک متنازعہ حکمران رہے۔ ان سے نفرت کرنے والوں کی اگر کمی نہیں تو ان سے محبت کرنے والے اور مداح بھی بے شمار ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ صدام حسین کا سارا دور حکمرانی جبر و تشدد پر مشتمل تا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس ظلم و تشدد کے پیچھے امریکہ جیسی سپر پاور موجود تھی جس نے کمال عیاری سے صدام حسین کو اپنا آلہ کار بنایا۔ صدام حسین پر سات جرم عائد کئے گئے:

1......کردوں کے خلاف کیمیائی گیس کا استعمال۔

2......شیعہ بغاوت کو بے رحمی سے کچلنا۔

3......فرقوں کے لوگوں کی اجتماعی قبریں بنانا۔

4......ایران سے جنگ۔

5......کویت پر قبضہ۔

6......سیاسی لیڈروں کا قتل۔

7......مذہبی رہنماؤں کا قتل۔

صدام حسین نے ابتدائی پیشی میں ان الزامات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ صدام حسین کے خلاف مقدمہ عراقی عدالت میں چل رہا ہے لیکن اس کے پیچھے جو طاقت متحرک ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔ اگر مقدمہ چلانا مقصود ہے تو پھر عالمی عدالت میں چلایا جائے۔ جہاں کے جج اپنے پیشے کے لحاظ سے تجربہ کار، معروف اور غیر جانبدارانہ ساکھ کے حامل ہیں۔ جبکہ عراقی عدالت کے جج خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ماضی کے جلاوطن یا صدام حسین کے قیدی رہے ہیں۔ اس لیے ان کی غیر جانبداری اور انصاف شکوک اور شبہات سے کیونکر پاک ہوگا۔

امریکہ نے دوسری جنگ عظیم کے بعد سے برطانیہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پوری دنیا میں اپنی شہنشاہیت قائم کرنے کا پروگرام بنایا۔ برطانوی عروج کے خاتمے کے بعد امریکہ سپر پاور کے طور پر سامنے آیا۔ آج ہر طرح سے امریکی عزائم دنیا کے سامنے آچکے ہیں جن کے تحت وہ ساری دنیا پر اپنی حکمرانی کو حقیقت کا روپ دینا چاہتا ہے۔ امریکہ کے استعماری عزائم حالیہ عالمگیر دہشت گردی سے کھل کر سامنے آگئے ہیں مگر یہ مذموم عزائم اس کی بنیاد اور فطرت میں شامل ہیں۔ یہ سولہویں صدی کا واقعہ

ہے کہ جب برطانیہ نے اپنے ملک کے تمام جرائم پیشہ افراد، قاتلوں، ڈاکوؤں اور سمندری قزاقوں کو جمع کیا اور انہیں نو دریافت شدہ براعظم امریکہ میں دھکیل دیا۔ ان مسلح قانون شکن عناصر نے بڑے پیانے پر مقامی باشندوں جنہیں ''ریڈ انڈینز'' کہا جاتا تھا کو بیدردی سے قتل کر کے ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ ان کے مال اسباب لوٹ لئے۔ خواتین کی بے حرمتی کی اور اس ملک کی معدنیات بالخصوص سونے کی کانوں کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ موجودہ امریکیوں کے ظالم آباؤ اجداد نے انسانیت کے خلاف دوسرا شرمناک جرم یہ کیا کہ بڑی تعداد میں انسانوں کو اغوا کر کے غلام بنانے اور ان کی تجارت کا قبیح سلسلہ شروع کر دیا۔ یہ ظالم افریقہ کے ساحلوں پر اترتے او اسلحہ کے زور پر نوجوان افریقیوں کو اغوا کر لیتے۔ اس دوران مزاحمت پر ہزاروں معصوم ان کے ہاتھوں بیدردی کیساتھ مارے گئے۔ امریکی حملہ آوروں نے ان بھوکے پیاسے مادرزاد ننگے غلام مردوں اور عورتوں کو جانوروں کی طرح جہازوں میں بھرا اور امریکہ پہنچا دیا۔ جہاں زندگی بھر کی افلاسی ان کا مقدر بن گئی۔ ان سے ہر طرح کے شرمناک کام لئے جاتے اور معاوضہ کے طور پر ایک پیسہ بھی نہ دیا جاتا۔ امریکہ میں آج جو کالے ہیں یہ دراصل انہیں مظلوموں کی اولاد ہیں۔ اسی عالمی شہنشاہیت کو قائم کرنے کی غرض سے دوسری جنگ عظیم میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرایا۔ اس حملے میں 30 ہزار انسان جل کر راکھ ہو گئے۔ 20 ہزار نے حملے کے بعد جان بچانے کے لیے دریا میں چھلانگ لگا دی اور ڈوب کر مر گئے۔ 60 ہزار سے زائد معذور ہو گئے۔ 35 ہزار بچے مردہ جبکہ 50 ہزار سے زائد معذور پیدا ہوئے۔ یہی نہیں آج بھی دنیا کا سب سے بڑا نیوکلیئر نائٹروجن، ہائیڈروجن، نیوٹران بم اور وار ہیڈ کا ذخیرہ امریکہ کے پاس موجود ہے۔ جسکی تعداد گیارہ ہزار سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ کے پاس ہزاروں یورینیم وار ہیڈز، کروز، ٹام ہاک، ڈیزی کٹر میزائل اور بڑے پیانے پر تباہی پھیلانے والے کیمیکل اور بائیولوجیکل اسلحہ کے انبار ہیں۔ مختلف ممالک کے معاملات میں ٹانگ اڑانے اور ان کی حکومتوں کے تختے الٹنے اور حکمرانوں کے قتل کرنے کے امریکی عزائم کا جائزہ لیا جائے تو 1890ء سے اب دہ 32 آزاد و مختار ممالک میں 100 سے زائد بار مداخلت کر چکا ہے۔ ان ممالک میں ارجنٹائن 1890ء، چلی 1891ء، ہیٹی 1890ء، ہوائی 1893ء، نکاراگوا 1880، اور 1894ء، پیورٹوریکو 1898ء ہنڈراس 1903ء، ڈومینکین ریپبلک 1903ء، کوریا 1950ء، گوئٹے مالا 67-60، 1954ء، انڈونیشیا 1958ء، کیوبا 1959ء، کانگو 1964، پیرو 1965ء، لاؤس 1964ء، ویتنام 1961ء، کمبوڈیا 1969ء،

گرینیڈا 1983ء، لبنان 1984ء، لیبیا 1986ء، ایل سیوا ڈور 1980ء، پانامہ 1989ء، سوڈان 1988ء، عراق 2003۔1993 اور افغانستان 2001ء شامل ہیں۔

امریکہ نے 1901ء میں فلپائن کے چھ لاکھ شہریوں کو قتل اور ان کی بیشتر خواتین کو بے آبرو کیا تھا۔ ویتنام میں تقریباً 30 لاکھ انسان امریکیوں کے ہاتھوں ذبح ہوئے۔ یہ امریکیوں کے نام نہاد کلچر کی مختصر تاریخ ہے۔ جو ان کی خونخواری وخونریزی، زر، زن اور زمین کی ہوس اور سازشوں سے عبارت ہے اور ان کی تاریخ کی ان جھلکیوں سے کوئی بھی دانا شخص امریکی قوم کے تمدن کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ امریکہ سے مسلمانوں اور خاص طور پر مشرق وسطیٰ میں قدم جمانے اور ان کو تشدد کا نشانہ بنانے کا بڑا مقصد اسرائیل کا تحفظ ہے۔ اسی وجہ ہے کہ آج اسرائیل تن تنہا سارے عرب ممالک کو خوف زدہ کیے ہوئے ہے کیونکہ اسے امریکہ کی پشت پناہی حاصل ہے اور وہ اسرائیل کو جدید اسلحہ سے لیس مضبوط ملک بنانے کا خواب پورا کر چکا ہے۔ اس کا اندازہ ہم امریکی صدور کے اسرائیل کی طرف جھکاؤ سے بخوبی لگا سکتی ہیں۔ امریکیوں کے مطابق اسرائیل بنانے سے اس کی حفاظت تک ان کی مذہبی ذمہ داری ہے۔ امریکی صدر جیفرسن نے اسرائیل کو بنانے کا مشورہ دینے کے ساتھ چلانے کا طریقہ بھی بتایا۔

امریکہ کے صدر ولسن نے برناڈور باروخ یہودی کو اپنا اقتصادی امور کا مشیر خاص بنایا اور بولیس برانڈلیس یہودی کو امریکی عدالت کا چیف جسٹس بنایا۔

امریکی صدر فرینکلن نے داؤد وسلمان علیہ السلام کے اسٹار کو فوج کے چھٹے عہدے پر فائز افراد اور محکمہ مواصلات کا رسمی نشان بنایا۔ امریکی کے صدر جان ایف کینڈی نے کہا کہ امریکہ نے اسرائیل کی حمایت کے لیے کھلے عام ذمہ داریاں اٹھائی ہیں اور ہم امریکیوں کے لیے اس میں ہی مصلحت ہے کہ ہم وہ پالیسی اختیار کریں جو امریکہ نے اسرائیل کی حمایت کے لیے نافذ کی ہے۔

امریکی صدر رچرڈ نکسن نے کہا کہ ہم نے اسرائیل کی بقاء کے لیے جو ذمہ داریاں اٹھائی ہیں وہ بہت گہری اور بہت مضبوط ہیں اور ہم اسرائیل کے رسمی دوست نہیں ہیں۔ ہم میں ایک رشتہ پایا جاتا ہے۔ جس نے ہمیں جوڑ کر رکھا ہوا ہے جو ہر کاغذ کی کترن سے مضبوط اور طاقتور ہے۔ وہ ہے روحانی اور مذہبی رشتہ۔ اور اس رشتہ کو امریکہ کے ماضی کے تمام صدور نے نبھایا ہے۔ اور اس رشتہ کو امریکہ صدق دل اور اخلاص سے نبھائے گا۔ امریکہ ہرگز اسرائیل کے دشمنوں کو ان کے اہداف کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچنے دے

گا، جنھوں نے اسرائیل کو تباہ کرنے کی قسم اٹھائی ہوئی ہے۔

امریکی صدر بش نے کہا کہ امریکہ نے 4.4 ارب ڈالر امدادی طور پر اسرائیل کو پیش کیے اور فلسطین میں روسی یہودی آباد کرنے کے لیے 10 ارب ڈالر خرچ کیے۔ امریکی صدر کلنٹن جن کا یہ ماٹو تھا کہ ہم اسرائیل کو ہرگز اور کبھی بھی ذلیل و رسوا نہیں ہونے دیں گے حالیہ امریکی صدر بش نے تمام سابقہ تمام صدور کا ریکارڈ توڑ دیا اور صلیبی جنگ شروع کر کے عظیم اسرائیل کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا عزم کر رکھا ہے۔ ان تمام حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ امریکہ اپنے مفادات کے لیے مسلمانوں کا خون ناحق کرتا ہے۔ امریکی تھنک ٹینک کا منصوبہ تھا کہ وہ عراق پر قبضہ کے بعد یہاں امریکہ کا مستقل اڈہ قائم کرے گا جس کے تمام اخراجات عراقی تیل سے پورے کیے جائیں گے۔ افغانستان پر امریکہ کے قبضے کا مقصد وسط ایشیا کے تیل و گیس کو پائپ لائن کے ذریعے بھارت لانا ہے تاکہ خود دولت کمائے۔ افغانستان کی طالبان حکومت نے اس امریکی لائن کو افغانستان سے گزرنے کی اجازت نہ دی تو ڈالروں کی رسیا قوم کو ایک کمزور مسلم حکومت کے اس چیلنج سے بڑا دکھ ہوا۔

اس کے بعد افغانستان کو فتح کرنے کا منصوبہ بنا اور آخر کار گیارہ ستمبر کے حملے کی آڑ میں اس پسماندہ ملک پر بموں کی بارش کر دی اور اس پر قابض ہو گئے۔ امریکہ افغانستان کی دلدل میں پھنس چکا ہے۔ وہ امریکیوں کے ڈالروں سے افغانستان کے اخراجات پورے کر رہا ہے۔ یعنی تعلیم اور صحت کے پروگرام کی تشہیر ہوتی ہے اور کبھی نئے جمہوری نظام کی نوید سنائی جاتی ہے۔ عراق پر قبضے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح تیل کی دولت کے ساتھ ساتھ اسرائیل سارے جزیرہ نما عرب میں اپنی ریاستوں کو کنٹرول کرے گا اور اس طرح عرب کی کمزور ریاستیں ہمیشہ کٹھ پتلی کا کردار ادا کرتی رہیں گی اور ان کے تیل پر قبضہ کر کے اینگلو امریکی اپنی دوسرے مقاصد کو حاصل کریں گے۔ دیکھنے میں یہ منصوبہ آسان تھا مگر اس میں مشکل تب آئی جب عراقیوں نے ہتھیار اٹھا کر جہاد کا نعرہ بلند کیا اور وہ امریکہ کی کامیابیوں میں بڑی رکاوٹ بن گئے۔

مقتدیٰ الصدر کے حامیوں نے کئی شہروں کا کنٹرول سنبھال لیا تھا اور مذاکرات کے بعد علاقے کا کنٹرول عراقی فوجیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ پورے عراق میں ایک خونی جنگ لڑی جانے لگی۔ خودکش حملوں اور اغوا کی کارروائیوں میں ہزاروں لوگ مارے جا چکے ہیں۔ حال ہی میں چیئرمین سائنس بورڈ کو امریکی ڈپٹی سیکرٹری آف ڈیفنس پال ولف وٹز نے ایک میمورنڈم لکھا ہے کہ ”ہمارا عراق

پر حملہ دنیا میں جاری دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ایک طویل عرصے تک جاری رہنے کا امکان ہے، لیکن اب تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عراق امریکیوں کے لیے ناشتہ تھا۔ امریکی دوپہر کا کھانا کس جگہ کھائیں گے۔ ایران یا شام اس کا فیصلہ نہیں ہو پا رہا؟''

امریکہ کی تاریخ کی پہلی جنگ جس کی بنیاد'' جھوٹ پر رکھی گئی انہوں نے اسے ایک بہترین موقع جانا اور اکیلے اس جنگ میں کودنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس امید کیساتھ کہ یہ آپریشن زیادہ عرصہ جاری نہیں رہے گا اور امریکی فوجیوں کا خوشی سے ناچتے ہوئے استقبال کیا جائے گا۔ لیکن عراقی عوام کی مزاحمت دیکھ کر ویت نام کے لوگوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ جنہوں نے امریکیوں کو ذلیل و رسوا کر کے ملک سے نکالا تھا۔ اب ہر آئے روز کوئی نہ کوئی بڑا دھماکہ ہوتا ہے جسے امریکہ اور اس کی کٹھ پتلی حکومت کی کارکردگی اور عراقیوں کی امریکہ کے ساتھ نفرت کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔

دوسری طرف امریکہ نے 30 جنوری 2005ء کو انتخابی ڈھونگ رچا کر اپنی مرضی کے وفاداروں کو اقتدار تک پہنچا دیا۔ یہ انتخابات سنگینوں، طیاروں کے سائے اور توپوں کی گھن گرج میں ہوئے۔ ان انتخابات میں 257 ممبران اسمبلی کا انتخاب ہوا تھا۔ تمام تر حفاظتی انتظامات کے باوجود عراق میں انتخابات کے دن 50 کے قریب افراد ہلاک ہوئے۔ ان انتخابات سے تین دن قبل ہی فضائی اڈے اور درآمدات معطل کر دی گئی تھیں اور کسی کو ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ جبکہ انتخابات سے قبل رات کو کرفیو نافذ کر دیا گیا۔

منصوبے کے مطابق شیعہ اکثریت کے علاقوں کربلا، نجف، مشرقی بغداد، سلیمانیہ اربیل، کرکوک اور سیسان میں عوام کی بڑی تعداد نے انتخابات میں حصہ لیا جبکہ سنی اکثریت کے علاقوں سامرا، لطیفہ، محمودیہ، فلوجہ، رمادی، موصل اور یوسفیہ وغیرہ میں ووٹنگ کا تناسب بہت کم رہا۔ حتیٰ کہ فلوجہ شہر میں محض ایک ووٹ ڈالنے کی اطلاع سامنے آئی۔ ان علاقوں میں پولنگ اسٹیشن کھلے ہی نہیں۔ جہاں کھلے تھے وہاں قبل از وقت بند کر دیئے گئے۔ الیکشن کمیشن نے پہلے 72 فیصد ٹرن آؤٹ کا دعویٰ کیا تھا لیکن بعد میں اسے ساٹھ فیصد تک محدود کر دیا گیا۔ یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ یہ قابضین ملک میں پہلے انتخابات ہیں جس میں کسی بین الاقوامی ایجنسی کو معائنے کی اجازت نہ دی گئی تھی۔ بلکہ انٹرنیشنل مشن فار عراقی الیکشن کا مرکز بھی پڑوسی ملک اردن میں تھا۔ جبکہ اکثر بین الاقوامی مبصرین اغواء کے خوف سے عراق جانے سے خوفزدہ رہے۔ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکہ نے اپنی وفادار حکومت کو تشکیل دیا اور جلال

طالبانی کو حسب توقع عراقی صدر منتخب کرلیا گیا۔ امریکہ کی یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ اگر وہ سمجھتا ہے کہ عراق میں انتخابی ڈرامہ رچا کر اور جمہوریت کی چھتری فراہم کر کے وہ ملک میں امن وامان قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ امریکہ کو آخر کار عراق سے ذلیل ورسوا ہو کر بھاگنا ہی پڑے گا۔ جس میں دوسری بڑی وجوہات کے علاوہ امریکہ کا مالی نقصان بھی ہے۔ آخری 60 سالوں میں عراق کی جنگ سب سے مہنگی ترین جنگ بن چکی ہے۔

اب تک عراق کی جنگ میں امریکہ کا 204 بلین ڈالر کا خرچہ ہو چکا ہے۔ جس کے مطابق ہر امریکی شہری کے ذمہ 727 ڈالر بنتے ہیں۔ اس میں وہ رقم جمع نہیں کی گئی جو کانگریس کے سامنے رکھی گئی ہے جو 45 بلین ڈالر ہے۔ اس کے علاوہ پینٹاگون نے عراق اور افغانستان میں جنگ جاری رکھنے کے لیے مزید 25 بلین مانگ لئے ہیں۔ ان تمام باتوں سے بچنے کے لیے مریکہ نے یہاں تک تجویز دی تھی کہ امریکی فوجیں عراقی بارڈر پر اور تیل کی تنصیبات پر اپنا قبضہ رکھیں گی اور اندرونی کنٹرول عراقی گارڈز کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس طرح جانی و مالی نقصان سے بچا جا سکے گا۔

پینٹاگون کی دوسری رپورٹ کے مطابق عراق میں آپریشن کے دوران امریکہ کا ہر ماہ 5.6 بلین ڈالر خرچ ہو رہا ہے۔ اس کے برعکس ویت نام میں 1964ء سے 1972ء تک 5.1 بلین خرچہ ہر ماہ ہوا تھا۔ اس جنگ میں امریکی فوجی زیادہ مہنگا اسلحہ استعمال کر رہے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق واشنگٹن کو دس سالوں میں 700 بلین ڈالر خرچ کرنے ہوں گے۔ ویت نام کی جنگ سے 100 بلین زیادہ۔ اگر 204 بلین ڈالر جنگ پر خرچ ہوئے ہیں تو عراق کے اس کے علاوہ بھی ہزاروں مسائل ہیں جن میں بنیادی مسائل میں 46 ملین عراقی لوگوں کو مکمل صحت کی سہولیات فراہم کرنا، 3.5 ملین استادوں کا انتظام کرنا اور دو ملین لوگوں کے لیے گھر بنانا جیسے سنگین مسائل کا بھی سامنا ہے۔ اس رقم میں ان لوگوں کو شامل نہیں کیا جو عراقی گارڈز کے طور پر کام سرانجام دے رہے ہیں جن کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ اگر یہ رقم فلاحی کاموں پر خرچ کی جائے تو پوری دنیا میں سے 3 سال کے لیے بھوک ختم ہو جائے۔ لوگوں کو ایڈز سے بچاؤ کی ادویات فراہم کی جا سکیں اور صاف پانی پسماندہ ممالک کے لیے فراہم کیا جا سکے۔

مالی نقصان کے علاوہ امریکہ کو جانی نقصان بھی اٹھانا پڑ رہا ہے۔ اب تک 1900 امریکی ہلاک اور

14000 کے قریب زخمی ہوئے ہیں۔اس کے مقابلے میں عراقیوں کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ اب تک ہلاک ہونے والے عراقیوں کی تعداد 24489 اور زخمیوں کی تعداد تقریباً 120000 کے قریب ہے۔

ان کا تفصیلی جائزہ ہم نیچے دیئے گئے ٹیبل سے کر سکتے ہیں۔اس کے علاوہ چالیس سے پچاس ہزار افراد کو گرفتار کیا گیا۔ بیروزگاری میں 20 سے 60 فیصد تک اضافہ ہوا۔اب تک عراق کے تقریباً 6000 فوجی اور پولیس اہلکار ہلاک ہو چکے ہیں جن میں بڑی تعداد آخری سال ہلاک ہونے والوں کی ہے۔امریکہ کی ناکامی کا ثبوت پینٹاگون کی وہ رپورٹ ہے جس کے مطابق عراق میں امریکیوں پر حملوں میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے اور مزاحمت کاروں کی تعداد میں دس سے بیس ہزار تک کا اضافہ ہوا ہے۔

امریکی فوجیوں میں بغاوت جڑ پکڑ چکی ہے اور اسی کے پیش نظر امریکہ سے 48000 نئے نیشنل گارڈز اور ریزرو رکھے ہیں جو کہ آفیسر و دوسرے شعبوں میں ملازم ہیں جن میں بڑی تعداد پولیس، فائر مین اور ایمرجنسی میڈیکل کے باشندے شامل ہیں۔

اختتامیہ عراق جنگ:

عراق پر حملہ سراسر زیادتی اور مسلمانوں کے خلاف لڑی جانے والی صلیبی جنگوں کا حصہ ہے۔جسکے متعلق ایک بار امریکی صدر بش بھی کہہ چکے ہیں۔اس کے علاوہ حال ہی میں سابق امریکی وزیر داخلہ کا ایک بیان بھی عراق کی جنگ کو ناانصافی سے جوڑتا ہے۔انہوں نے اپنے بیان میں کہا:

"میں نے عراق جنگ کی حمایت میں اقوام متحدہ میں جو تقریر کی تھی، وہ ان کے ریکارڈ پر ایک داغ ہے۔"

کولن پاؤل نے فروری 2003ء میں سلامتی کونسل میں صدام حسین کے پاس بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی موجودگی کا دعویٰ ثابت کرنے کی کوشش میں جاسوس سیارے سے اتاری گئی ٹرکوں کی تصاویر بھی پیش کی تھیں اور ان ٹرکوں کو کیمیائی ہتھیاروں کی موبائل لیبارٹریاں قرار دیا تھا۔اور امریکی حملے کے بعد بھی اب تک عراق میں کوئی ایٹمی جراثیمی یا کیمیاوی ہتھیار نہیں مل سکے۔انہوں نے کہا کہ یہ جھوٹ اس وقت بھی ان کے لیے ذہنی تکلیف تھی اور اب بھی۔انہوں نے مزید کہا کہ میں نے

تقریر سے قبل پانچ دن سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر میں انٹیلی جنس رپورٹوں کے مطالعہ میں گزارے تھے۔ اس وقت سی آئی اے کے سربراہ جارج ٹینٹ ان کے پاس نہیں بیٹھے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی جو رپورٹیں دکھائی جارہی ہیں وہ حقائق پر مبنی ہیں۔ مگر سی آئی اے کے کافی عہدیداروں کو اس کی حقیقت کا پتہ تھا مگر وہ جارحیت پسند تھے۔ کولن پاؤل نے کہا کہ انہوں نے گیارہ ستمبر کے حملوں میں صدام حسین کے ملوث ہونے کے متعلق آج تک کوئی ثبوت نہیں دیکھا۔ کولن پاؤل نے مزید کہا کہ صدام حسین کی حکومت کے خاتمے کے بعد عراقی افواج کی نگرانی رکھنے کے سوا کوئی دوسرا چارہ نہیں تھا۔ لیکن ہم نے پورے عراق پر کافی فوجی نفری کیساتھ مکمل کنٹرول کے لیے زیادہ کچھ نہیں کیا۔ ورنہ عراق میں اتنی غلاظت نہ پھیلتی اور معاملات مختلف ہوتے۔ انہوں نے عراق میں خانہ جنگی کے سلسلے پر تشویش کا اظہار کیا اور کہا کہ امریکہ عراق میں ناکام ہو چکا ہے اور اگر سنیوں کو اقتدار میں شامل نہ کیا گیا تو عراق یقینی طور پر چھوٹی مملکتوں میں بدل جائے گا۔

اب ہم اس جنگ کا جائزہ ٹیبل کی مدد سے لیتے ہیں:

کئی اتحادی اس خونریزی کی وجہ سے اتحاد سے نکلنے کا سوچ رہے ہیں۔ اب ہم ایک نظر عراق میں 34 ممالک کی افواج پر دوڑاتے ہیں:

1......امریکی	135000
2......برطانوی	11000
3......اٹلی	2700
4......پولینڈ	2400
5......یوکرین	1700
6......سپین	1300 (واپس چلے گئے)
7......نیدرلینڈ	1100
8......آسٹریلیا	850
9......جنوبی کوریا	700
10......رومانیہ	700

11......جاپان	560
12......ڈنمارک	496
13......بلغاریہ	470
14......تھائی لینڈ	460
15......ہانڈوراس	370
16......السالویڈور	306
17......ہنگری	300
18......ڈومنکین ری پبلک	300
19......نکاراگوا	230
20......سنگاپور	200
21......منگولیا	180
22......آذربائیجان	151
23......ناروے	150
24......پرتگال	128
25......لیٹویا	121
26......لتھوانیا	105
27......سلاویکیا	105
28......فلپائن	96
29......جمہوریہ چیک	89
30......البانیہ	70
31......جارجیا	70
32......نیوزی لینڈ	60

33......ایسٹونیا 55

34......قازقستان 29

35......مقدونیہ 28

36......مالڈووا 24

اب ہم عراق میں ہلاک ہونے والے اتحادی فوجیوں کا جائزہ ایک ٹیبل کی مدد سے لیتے ہیں۔ جسے ہمیں ان ہلاکتوں کے بارے میں تفصیل سے معلومات فراہم کی گئی ہے۔

پیریڈ	امریکی	برطانوی	اتحادی	کل	اوسط	دن
20 مارچ تا یکم مئی 2003ء	140	33	0	173	4.02	43
2 مئی 2003ء سے 28 جون 2004ء	718	27	58	803	2.89	424
29 جون 2004ء سے 30 جنوری 2005ء	579	26	27	632	2.93	26
31 جنوری سے 9 ستمبر 2005ء	460	10	16	486	2.14	234
ٹوٹل	1897	96	101	2094	2.3	917

اب ہم ان ہلاکتوں کا جائزہ ایک ٹیبل کی مدد سے لیتے ہیں جہاں مہینوں کے حساب سے وضاحت کی گئی ہے:

پیریڈ	امریکی	برطانوی	اتحادی	کل	اوسط	دن
مارچ 2003ء	65	27	0	92	7.67	123
اپریل 2003ء	74	6	0	80	2.67	30
مئی 2003ء	37	4	0	41	1.32	31

جون 2003ء	30	6	0	37	1.2	30
جولائی 2003ء	48	1	0	49	1.58	31
اگست 2003ء	35	6	2	43	1.39	31
ستمبر 2003ء	31	1	1	33	1.1	30
اکتوبر 2003ء	48	1	2	47	1.52	31
نومبر 2003ء	82	1	27	101	3.67	30
دسمبر 2003ء	40	0	8	48	1.55	31
جنوری 2004ء	47	5	0	52	1.68	31
فروری 2004ء	20	1	2	23	0.79	29
مارچ 2004ء	52	0	0	52	1.68	31
اپریل 2004ء	135	0	5	140	4.67	30
مئی 2004ء	80	0	4	84	2.71	31
جون 2004ء	42	1	7	50	1.67	30
جولائی 2004ء	54	1	3	58	1.87	31
اگست 2004ء	66	4	5	75	2.42	31
ستمبر 2004ء	80	3	4	87	2.9	30
اکتوبر 2004ء	63	2	2	67	2.16	31
نومبر 2004ء	137	4	0	141	4.7	30
دسمبر 2004ء	72	2	3	77	2.48	31
جنوری 2005ء	107	10	10	127	4.1	31
فروری 2005ء	58	0	2	60	2.14	28

مارچ2005ء	36	1	3	40	1.29	31
اپریل2005ء	52	0	0	52	1.73	30
مئی2005ء	80	2	6	88	2.84	31
جون2005ء	78	1	4	82	2.77	30
جولائی2005ء	54	3	1	58	1.87	31
اگست2005ء	85	0	0	85	2.74	31
ستمبر2005ء	13	3	0	16	1.84	14
ٹوٹل	1897	96	101	2094	2.3	917

اس ٹیبل میں ہم امریکہ اور اتحادی فوجیوں کے زخمی ہونے کی تعداد کے متعلق دیکھتے ہیں جو کہ مہینوں کے مطابق بنایا گیا ہے

پیریڈ	تعداد
مارچ2003ء	22
اپریل2003ء	340
مئی2003ء	55
جون2003ء	147
جولائی2003ء	226
اگست2003ء	181
ستمبر2003ء	247
اکتوبر2003ء	413
نومبر2003ء	237
دسمبر2003ء	261
جنوری2004ء	188

فروری 2004ء	150
مارچ 2004ء	323
اپریل 2004ء	1213
مئی 2004ء	757
جون 2004ء	589
جولائی 2004ء	552
اگست 2004ء	895
ستمبر 2004ء	706
اکتوبر 2004ء	648
نومبر 2004ء	1423
دسمبر 2004ء	542
جنوری 2005ء	497
فروری 2005ء	413
مارچ 2005ء	371
اپریل 2005ء	595
مئی 2005ء	569
جون 2005ء	501
جولائی 2005ء	573
اگست 2005ء	451
ٹوٹل	14265

2005ء میں عراقی پولیس اور ملٹی کے مارے جانے والوں کی تعداد کا جائزہ اس ٹیبل سے لگاتے ہیں:

پیریڈ	تعداد

جنوری2005ء	109
فروری2005ء	103
مارچ2005ء	200
اپریل2005ء	199
مئی2005ء	259
جون2005ء	296
جولائی2005ء	304
اگست2005ء	282
ستمبر2005	73
ٹوٹل	1830

حوالہ جات

نام کتاب	نام مصنف
عظیم طاقتوں کا عروج وزوال	پال کینڈی
بش ایٹ وار	باب وڈورڈ
تاریخ میں سفر	عدنان طارق
سی آئی اے کی خفیہ جنگیں	پیٹر ہارکلیروڈ
مدینہ سے وائٹ ہاؤس تک	محمد انیس الرحمٰن
حساس ادارے	بریگیڈیئر (ر) سید احمد ارشاد ترمذی
قبلہ اول کفار کے حصار میں	مولانا محمد ارسلان بن اختر
تاریخ عالم پر ایک نظر	جواہر لال نہرو
بیسوی صدی کا انسائیکلوپیڈیا	اعظم شیخ
بین الاقوامی امن معاہدے	مرتضیٰ انجم
سو عظیم آدمی	مائیکل ہارٹ
تاریخ عالم کے سو شیطان	مارٹن گلیمن والکاٹ
سقوط بغداد سے سقوط ڈھاکہ تک	میاں محمد افضل
اور امریکہ لرز اٹھا!	طارق اسماعیل ساگر
پاکستان کیوں ٹوٹا؟	ڈاکٹر صفدر محمود
قوموں کی شکست وزوال کے اسباب کا مطالعہ	ڈاکٹر آغا افتخار حسین
برطانوی راج	ڈاکٹر مبارک

★...... مسلمانوں کا سیاسی عروج و زوال — کیرن آرم سٹرانگ

★...... اکابرین تحریک پاکستان — محمد علی چراغ

★...... تاریخ اور تحقیق — ڈاکٹر مبارک علی

★...... ہفت روزہ ندائے ملت

★...... روزنامہ نوائے وقت

★...... انٹرنیٹ

ابھی تو اس کے کھیلنے کودنے اور اودھم مچانے کے دن تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ علم وادب اور تحقیق کی چوٹی سر کرنے کا جذبہ اسے کہاں سے ملا؟ شہباز حسین بارا، ایف سی کالج میں میرا اسٹوڈنٹ تھا۔ایک شریف النفس اور کم گو نوجوان علم وادب کے راستے پر کیسے چل نکلا؟ یہ ''معمہ'' میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ یہ شاید خاندانی تربیت کا اثر ہے کہ جس عمر کے نوجوانوں کو ''روشن خیالیوں'' سے فرصت نہیں ہوتی، اس عمر کے نوجوان نے اپنی پہچان قائم کرنے کے لئے ایک ایسے شعبے کا انتخاب کیا جو انتہائی باوقار اور منفرد ہے۔ میں نے مختلف اخبارات میں شائع ہونے والے اس کے تحقیقی مضامین پڑھے ہیں، یہ مضامین اس بات کی گواہی ہیں کہ ہماری نوجوان نسل نے اپنی تاریخ کو مکمل طور پر فراموش نہیں کیا۔ جو قومیں تاریخ کو فراموش کردیتی ہیں، دنیا کے نقشے سے ان کا وجود ختم ہوجایا کرتا ہے۔ شہباز حسین بارا اپنی قوم کے وجود کو قائم رکھنے کے درپے ہے۔ سقوط غرناطہ پر شائع ہونے والے اس کے تحقیقی مقالے نے تو مجھے حیرتوں کے ایک عجیب جہان میں گم کرکے رکھ دیا ہے۔ میں سوچنے لگا ہوں یہ کیسا شاگرد ہے جو علم کے میدان میں اپنے استادوں سے بھی آگے نکلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ میرے اس عزیز شاگرد نے لکھنے لکھانے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے، وہ جاری رہا تو میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں وہ مستقبل کا ایک ایسا لکھاری بنے گا جس پر ہم سب رشک کرسکیں گے۔ اللہ کرے زور قدم اور قلم اور زیادہ۔

پروفیسر توفیق بٹ، (کالم نگار روزنامہ جناح لاہور)